Title - Intikhab-E-Jadeed

Creator - Murattiba Aal Ahmad Sarwar Aur Aziz Ahmad

Publisher - Anjuman Taraqqi Urdu Pakistan (Karachi)

Date - 1965

Pages - 276

Subjects - Urdu Shayari - Intikhab Kalaam.

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) نمبر ۱۹۰

شعرائے عصر کے کلام

کا

انتخابِ جدید

۱۹۲۴ء تا ۱۹۴۲ء

مرتبہ

جناب عزیز احمد صاحب استاد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

و

جناب آل احمد صاحب سرور استاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شائع کردہ

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

پہلا ایڈیشن ۱۹۴۳ء قیمت مجلد [illegible] بلا جلد [illegible]

(مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس دہلی)

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) نمبر ۱۹۶

شعرائے عصر کے کلام

کا

انتخابِ جدید

سنہ ۱۹۲۴ء تا سنہ ۱۹۴۲ء

مُرتّبہ

جناب عزیز احمد صاحب اُستاد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

و

جناب آل احمد صاحب سرور اُستاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۹۴۳ء

قیمت مجلد [illegible] بلا جلد [illegible]

فہرستِ مضامین

دیباچہ

اُردو شاعری میں کسی زمانے میں اتنا تنوّع نہ تھا جتنا آج کل ہے۔ یہ تنوّع ہماری زندگی سے آیا ہے۔ جنگِ عظیم نے ساری دُنیا کو ایک سی رحمتیں اور لعنتیں عطا کیں اور ہندستان بھی جو ذہنی اعتبار سے متمدّن دنیا سے کچھ بیگانہ سا ہو رہا تھا۔ ان سے اپنا دامن محفوظ نہ رکھ سکا۔ جنگِ عظیم سے پہلے ہماری شاعری ایک خاموش اور پُرسکون دریا کی طرح تھی، اس کے بعد اس میں طوفانوں کی تیزی اور بے مہری، تباہی اور غارت گری اور زرخیزی اور زندگی آگئی۔ اُنیسویں صدی کے آخر میں لبرل تحریک زوروں پر تھی۔ جنگ سے پہلے تک اس کا اثر رہا، چناں چہ ہندستان میں بھی ایک متین، سنجیدہ، شریفانہ، مدّھم سی تحریک اصلاح اور آزادی کے لیے ہو رہی تھی۔ حالی نے زمانے کی رفتار پر چلنا سکھایا تھا، زندگی کی تلخیوں اور حقیقتوں کا احساس دلایا تھا شاعری کو انسانیت کا علَم بردار بنانے کی کوشش کی تھی، اُن کی یہ کوشش بار آور ہو رہی تھی۔ مخزن میں جدید طرز کی نظمیں لکھی جا رہی تھیں، وطن کی محبت، مناظرِ فطرت، ماحول کی عکّاسی، قومی اور سیاسی بیداری، انگریزی نظموں کے ترجمے، سب کچھ ملنے لگے تھے۔ مگر ابھی تک امیر و داغ کے چٹ پٹے اشعار مزا دیتے تھے۔ لوگ حالی کی "اُبالی کھچڑی اور بے نمک سالن" کی ضرورت تو محسوس کرتے تھے مگر جان اُسی گرم مسالے پر دیتے تھے جو رندانہ اور بوالہوسانہ غزلوں کی شکل میں انھیں ملتا تھا۔ اقبال کے پہلے دور کی شاعری، چکبست کی قومی نظمیں، سرور جہاں آبادی، وحید الدین سلیم، خوشی محمد ناظر، نظم طباطبائی، شوق قدوائی کی نظمیں، اور عزیز لکھنوی،

ثاقب لکھنوی، ریاض خیرآبادی، شاد و حسرت وغیرہ کی غزلیں جنگِ عظیم سے پہلے کے مزاج کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس جنگ نے پچھلے دور کے اور ہمارے درمیان خلیج حائل کر دی ہے اور ہمارے ذہن کو اس قدر بدل دیا ہے کہ اب ہمارے لیے اس مزاج کا تصور بھی آسان نہیں۔

ادب میں کوئی ایک سال مشکل سے حدِ فاصل کیا جا سکتا ہے، مگر ۱۹۱۴ء بہت بڑی حد تک ایک بساط کے اُلٹنے اور دوسری کے بچھنے کو ظاہر کرتا ہے۔ دراصل کوئی ادبی بساط اس طرح نہیں بدلی جاتی جس طرح کیلنڈر کے اوراق بدلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو اس انتخاب میں جنگِ عظیم سے پہلے کی چیزیں بھی کافی مل جائیں گی اگر ہمارے ذہنی سفر کے لیے ۱۹۱۴ء اس وجہ سے اور بھی موزوں ہے کہ اسی سال حالی اور شبلی کا انتقال ہوا۔ کوشش کی گئی ہے کہ ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک کے تمام اہم شعرا کا انتخاب آجائے۔ ممکن ہے کہ بعض اشخاص کو اپنے محبوب شعرا اس میں نظر نہ آئیں، یا اُن کے لیے صفحات میں اتنی گنجایش نہ نکلی ہو جتنی دل میں ہے۔ مگر اس انتخاب میں صرف اچھّی اچھّی نظمیں اور غزلیں جمع کرنا مقصود نہ تھیں۔ پورے دور کی ایک نمایندہ تصویر مرتّب کرنی تھی۔ موجودہ شاعری کے معنی صرف جدید شاعری کے نہیں ہیں۔ اس میں قدیم رنگ کے نمونے بھی اپنی بہار دکھاتے ہیں اور سب مل کر ایک قوسِ قزح کی سی کیفیت پیدا کرتے ہیں، مگر چوں کہ جدید اثرات ہمارے سماج پر اس وقت زیادہ اثر انداز ہیں اس لیے اُن کا تناسب قدرتی طور پر زیادہ ہے

۱۹۱۴ء سے پہلے تک نظموں پر حالی کا اثر تھا اور غزلوں پر داغ اور امیر کا۔ مگر بڑی بات یہ تھی کہ غزل کی دنیا میں ایک خاموش تبدیلی ہو رہی تھی۔ غالب اور میر لکھنؤ کے دل میں گھر کرتے جا رہے تھے اور اگرچہ لکھنؤ کی اپنی ادبی روایات سب موجود تھیں مگر غالب کے خیال کو میر کی زبان میں ادا کرنے کی کوشش جاری تھی۔

انیسویں صدی کے آخر میں لکھنؤ کچھ اپنی چار دیواری کے اندر بند ہو کر بیٹھ گیا [illegible] قلعہ بندی اس قدر مضبوط تھی کہ جب سارا ملک حالی کے نغموں سے گونج رہا تھا اس وقت بھی لکھنؤ حالی کا مذاق ہی اڑاتا تھا۔ مگر وہ غالب کو اپنے دل میں جگہ دے رہا تھا۔ عزیز لکھنوی اگرچہ قدیم رنگ کے شاعر ہیں مگر جہاں تک لکھنؤ کا تعلق ہے وہ انقلابی کہے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے اور ثاقب لکھنوی نے ناسخ کے بجائے غالب سے فیض حاصل کیا۔ وہ ناسخ کو چھوڑ نہ سکے، مگر غالب کو اپنانے کی کوشش میں خود بن گئے۔ اس تحریک سے بڑے خوش گوار نتائج مرتب ہوئے۔ اس نے لکھنؤ میں میر کو پھر روشناس کرایا اور اثر کو پیدا کیا۔ میر کو صرف لکھنؤ ہی میں نہیں، دوسرے مرکزوں میں بھی، اُن کی اصل جگہ ملی، شاد نے ان کی سی طویل بحروں میں ایک عجیب و غریب تھرتھراہٹ پیدا کی، حسرت نے اُس مصحفی کو پہچانا جو میر سے متاثر تھا اور اسے اس کا اصلی مقام دیا۔ فانی جب غالب کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے تھک گئے تو میر نے انھیں سہارا دیا۔ چناں چہ تقریباً ۱۹۲۰ء تک غزل پہ شروع شروع میں امیر و داغ اور بعد میں غالب و میر کا پرتو نظر آتا ہے۔

نظم کی دنیا، اردو شاعری میں پہلی مرتبہ، غزل سے کسی طرح ہیٹی نہیں۔ اس میں حالی و شبلی کے بعد اسمٰعیل، اکبر، چکبست، اقبال، سلیم، سرور جہاں آبادی، شوق قدوائی اور بے نظیر شاہ وغیرہ کے نام ممتاز ہیں۔ ان کے یہاں ایک نیا ذہن، ایک نیا احساس اور ایک نیا جذبہ ملتا ہے۔ ان میں انتہا پسند کوئی نہیں اور اکبر تو قدامت پرست اور تنگ نظر ہیں مگر پچاس برس پہلے کے شاعر ان کا کلام سنتے تو حیران رہ جاتے۔ وطن سے محبت، وطن کے ماضی کی سنہری تصویریں، اس کی تاروں بھری راتیں۔ اور ٹھنڈی ہوائیں، اس کے لہلہاتے ہوئے میدان، اور گنگناتے ہوئے دریا، ہر شاعر کے دل میں بسے ہوئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ

ان چیزوں کو جو صدیوں سے یہاں موجود تھیں، لوگوں نے پہلی دفعہ دیکھا ہو۔ اور واقعی اس ملک کے باسیوں کو اپنے وطن کی محبت کا یہ احساس پہلی دفعہ اتنی شدت سے ہوا تھا کہ اس کی ایک مشتِ خاک کے بدلے بہشت بھی لینے کو تیار رہتے۔ یہ احساس مغربی تعلیم کا بھی نتیجہ تھا اور ہندستان کی سیاسی جدّوجہد کا بھی۔ اُن لوگوں کے لیے جن کی آنکھیں صرف اندر کی طرف کھلتی تھیں اور جو صرف اپنے من کی دُنیا میں مست رہتے تھے یہ فطرت کا مشاہدہ اور ماحول کا مطالعہ کچھ نیا نیا سا تھا اور نیا ہونے کی وجہ سے کچھ عجیب سا اس دور میں جتنی نظمیں مقامی اثرات کی حامل ہیں شاید نظیر کے بعد کسی دور میں بھی نہیں۔

ایک طرف اسمٰعیل، چک بست، بے نظیر اور سرور جہاں آبادی اس نئی ہندستانیت کی مصوّری کر رہے تھے، دوسری طرف اکبر جو پرانی ہندستانیت یا مشرقیت کے پرستار تھے، مغربی تہذیب کے طوفان سے اسے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک اپنی وضع کو بدلنا چاہتا تھا، دوسرا اس پر قائم رہنا چاہتا تھا۔ اکبر کی شاعری میں طنز و ظرافت کی بڑی بلند پایہ مثالیں ملتی ہیں۔ مگر ان کی شاعری ایک ٹریجڈی ہے اُن کے یہاں خندہ نہیں اصیل میں نہیں گریۂ ابرِ بہار بھی ہے۔ اُن کے نشتر اپنے اندر ایک بڑی المیہ داستان رکھتے ہیں۔ مشرقیت کا یہ پرستار، ہر چیز کو جذبات کی عینک سے دیکھتا تھا اور ہر نئی چیز کے سائے سے بھڑکتا تھا۔ اس نے ساری عمر بتوں کے عشق میں گزاری تھی اور آخر میں باخدا رہنا چاہتا تھا مگر اب اس کے راستے میں ؟ حائل ہوتی تھی۔ اُسے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ "ٹلتی نہیں آئی ہوئی" مگر پھر بھی اس نے مغربی تہذیب، مغربی معاشرت، اور مغربی سیاست پر ایسے وار کیے کہ مغربیت کے خلاف ردِّعمل جلد شروع ہو گیا۔ اکبر نے اپنے بعد اقبال کو چھوڑا جو اگرچہ مغرب سے بہت کچھ لے چکے تھے۔

[illegible]وں سے بہت بیزار تھے اور دوسری طرف ظفر علی خاں اور ظریف لکھنوی کو۔ ظفر علی خاں اگر سیاست سے ذرا علیحدہ رہتے تو وہ دوسرے اقبال ہو سکتے تھے۔ ہاں یہ تصور بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اگر اقبال سیاست میں اور زیادہ پڑ جاتے تو وہ ظفر علی خاں کی سطح پر اُتر آتے یا نہیں؟

اقبال کی شہرت یوں تو ترانۂ ہندی، شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع و شاعر، جیسی نظموں سے سارے ملک میں ہو چکی تھی، مگر اس وقت تک وہ درحقیقت مقلد تھے۔ ان کی وطنی شاعری حالیؔ اور مخزن کی تحریک سے متاثر تھی، ان کی اسلامی شاعری مسدس اور اکبر کے نشتروں سے گو اُن کے فلسفہ اور مغربی تہذیب و تمدن کے مطالعے نے اس میں گہرائی، واقعیت اور ایک انوکھا پن ضرور پیدا کر دیا تھا۔ وہ اس وقت تک مصوّر تھے، لیکن خضرِ راہ کی اشاعت سے وہ ذہنی آتش فشاں اپنی اصل شان سے نمودار ہوتا ہے جس کا نام اقبال ہے۔ خضرِ راہ بظاہر صرف عالمِ اسلامی کے انتشار اور جنگِ عظیم کے تاثرات پر ایک دُکھے ہوئے دل کی پکار ہے۔ مگر دراصل وہ ایک مفکّر۔ شاعر کا عہد نامۂ جدید (New Testament) ہے۔ اس سے پہلے جنگ کا اثر ہندستان میں کسی نے اتنا محسوس نہیں کیا تھا اور نہ کسی نے اتنے اعتماد سے "ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم" چھوڑ کر آفتابِ تازہ کا خیر مقدم کیا تھا۔ سیاسی الجھنیں، اقتصادی مسائل، شہنشاہیت کے خلاف جہاد، غرض وہ سب چیزیں جو ہماری زندگی کا جزو بن گئی ہیں، اقبال کے خضرِ راہ کے ذریعے سے ادب بنیں، اس کی حیثیت انقلابی ہے۔

جنگِ عظیم کے بعد ہندستان میں ایک جذباتی سیلاب آیا۔ یہ سیلاب کچھ تو اُن امیدوں کی وجہ سے پیدا ہوا جو جنگ کے دوران میں ہندستانیوں نے انگریزوں سے وابستہ کی تھیں اور جن کے صلے میں اُنھیں رولٹ ایکٹ، مارشل لا

اور جلیان والا باغ ملا، اور کچھ تنزل سے ہمدردی کی وجہ سے جذبات کے اس سمندر میں پورے ہندستان نے ایک ساتھ غوطہ لگایا اور اپنی رگ رگ میں ایک خاص محسوس کی۔ ایک بہتر دن کی خواہش، ایک نئے دور کی تلاش، ایک نئے نظامِ زندگی کی نوید صرف طلوعِ اسلام کے آخری بند ہی میں نہیں ساری اُردو شاعری میں ملنے لگتی ہے۔ ہمارے شاعر اب 'تھا' کی بجائے 'ہوگا' اور کرتے تھے کے بجائے کریں گے کے تصور سے مست ہونے لگتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھیں افق پر گاڑے ہوئے ایک آنے والے زمانے کا خواب دیکھتے اور دکھانے لگتے ہیں۔ وہ اپنے سنہرے خوابوں کی دنیا میں پہنچ کر تھوڑی دیر کے لیے حال کی تلخیوں اور مایوسیوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔ اُن کی ذہنی زندگی کو غذا مغرب کے دیے ہوئے تصورات سے ملتی ہے۔ مغرب اُنھیں آفاقی نظر دیتا ہے اور مجلس اقوام کا مرمریں بت اُن کے سامنے پیش کرتا ہے۔ سوشلزم، سائنس کے کرشمے، میکانیکی زندگی کی برکات، عورتوں کی آزادی، عام تعلیم کا نصب العین، نوجوان ذہن کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ مغرب کی نعمتوں پر نظر جم کر رہ جاتی ہے، اُس کی لعنتیں جو پوشیدہ ہیں نظر نہیں آتیں۔ نئی نسل ذہنی اعتبار سے اور زیادہ مغربی ہوتی جاتی ہے اور مشرق اور مشرقیت سے بیزاری عام ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد سے اب تک جو کچھ ہوا وہ طلسم ہو یا نہ ہو ہوش ربا ضرور ہے۔ بیس سال کے تھوڑے سے عرصے میں زندگی کی رفتار تیز ہو گئی ہے، ذہن زیادہ حساس ہو گیا ہے، نفسیاتی شعور بڑھ گیا ہے۔ چیزوں کو توڑنے اور پھر سے جوڑنے، بت شکنی کرنے اور نئے بت بنانے کا شوق ہے، انقلابی تصورات صرف سیاسی مسائل ہی میں نہیں زندگی کے ہر شعبے میں دخیل ہیں، ساری دنیا ایک مرکز پر آگئی ہے۔ سائنس نے علمی دنیا ہی میں نہیں شعر و شاعری میں بھی دخل پا لیا ہے۔

جنگِ عظیم سے پہلے کی پُرسکون فضا میں ادبِ لطیف کی ذہنی عیاشی شروع ہوئی تھی۔ جنگِ عظیم کے بعد اس کی جگہ ترقی پسندی کی ننگی تلوار نے لے لی۔ الہلال اور ٹیگور سے ایک غلط تصوّر کی وجہ سے بلند آہنگ ترکیبیں رائج ہوگئی تھیں۔ اب (اقبال کے باوجود) حالی کی طرف پھر رُجحان ہونے لگا۔ قدیم غزل نے جس ماورائیت، تفلسف، تصوّف، انفرادیت، انانیت کا طلسم بنا رکھا تھا وہ شکست ہوتا گیا۔ غزل میں وہ لطافت نہ رہی مگر جان زیادہ آگئی۔ اس کی وہ بندھی ٹکی شریفانہ مگر مریض زبان جس میں زندگی کم تھی، روایت زیادہ اور جس کا رس پرانا ہونے کی وجہ سے تیزاب ہوگیا تھا۔ بدلی اور اپنی آزادی کو محسوس کرنے اور کرانے کے لیے لوگوں نے زبان کے ساتھ خوب خوب بے اعتدالیاں کیں، وہ رعایتیں اور صنعتیں، وہ اشارے اور کنائے جن پر ذوقؔ جیسے شاعر جان دیتے تھے اب کراہت پیدا کرنے لگے۔ (آزاد کا بیان ہے کہ ذوقؔ نے ظفرؔ کو ایک شعر دینے سے انکار کردیا تھا جس میں صرف یہ خوبی تھی کہ آنکھ کو بادام سے تشبیہ دی گئی تھی) یہ نیا مزاج ہمیں آج کل کی غزلوں اور نظموں سب میں مل جائے گا۔

راہوں، تصوّروں اور آرزوؤں کی اس بھول بھلیاں میں بھی جسے ہم آج کل کی ادبی زندگی کہتے ہیں بعض چیزیں صاف نظر آسکتی ہیں۔ مغربی شاہکاروں کے ترجمے، مغربی طرز کی نظمیں، مغربی اسلوب کی نقالی اور مغرب کے اثر سے شرقیت کا ایک نیا احساس، یہ سب ہمیں جنگ کے بعد بڑے جوش و خروش سے ملتا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری اور عظمت اللہ خاں دونوں پختگی کو نہ پہنچتے پائے، جوانی میں ہم سے رخصت ہوگئے۔ مگر دونوں کا ہم پر بڑا احسان ہے، جس کا پورا پورا اعتراف ابھی کیا نہیں گیا۔ شاید اس لیے کہ وہ باغی تھے اور باغیوں کو لوگ سزا دیتے ہیں انھیں ہار نہیں پہناتے۔ عظمت اللہ خاں نے رسمی غزل کے خلاف حالی سے

زیادہ سختی سے آواز بلند کی۔ انھوں نے اردو کے عروض کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی۔ خود نئے طرز کی نظمیں لکھیں اور اُن میں سے بعض ہماری شاعری میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ انھوں نے اور بجنوری نے تازگی اور جدّت کی ایک لہر پیدا کی اور صرف انگریزی کی بجائے یورپ کے دوسرے ادبیات کی چاشنی بھی ملائی۔ اُردو میں سانیٹ کو مقبول بنانے میں اختر شیرانی کا بھی حصّہ ہے جنھوں نے اپنی سلمیٰ کو زندہ جاوید کرنے کے لیے زیادہ تر یہی صنف پسند کی۔ ترقی پسند ادب

Blank Verse Free Verse

نے حال میں بے قافیہ نظم اور آزاد نظم کی طرف جو توجّہ شروع کی ہے وہ انھی رُجحانات کا نتیجہ ہے جو گزشتہ بیس سال سے نمایاں ہو رہے تھے۔ یہ محض زبان سے ناواقفیت یا فن سے بےنیازی کی غماز نہیں ہے۔ اس میں بعض سہولتیں اور آسانیاں ہیں۔ اس میں خیال پر اتنی پابندی نہیں ہوتی، روانی اور تسلسل کے راستے میں اتنے بند نہیں ہوتے۔ ایک آواز کو گم کرنے کے لیے سیکڑوں پیش رووں کی اتنی آوازیں نہیں ہوتیں جتنی مروجہ غزل اور نظم میں ہوتی ہیں۔ ابھی یہ صنف اُردو میں بالکل نووارد ہے۔ اسے ہمدردی اور رواداری سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے شعرا کی فطرت سے ہم آہنگ ہو سکی تو اس سے اُردو کو یقیناً فائدہ پہنچے گا ورنہ اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔ فیض، راشد کے یہاں آپ کو اس کے بعض قابلِ قدر نمونے مل جائیں گے۔

میں نے ابھی اشارہ کیا تھا کہ مغرب نے ایک مخصوص طریقے سے ہماری مشرقیت کو اُبھارا ہے۔ سجّاد حیدر نے ترکی ادب سے ہمیں روشناس کرایا۔ ظفر علی خاں نے جنگِ روس و جاپان پر ایک ڈراما لکھا مگر یہ راس مسعود مرحوم کی خوبی تھی کہ پیشہ ور ادیب اور شاعر نہ ہوتے ہوئے انھوں نے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو جاپان کی طرف متوجّہ کیا۔ جاپان اور حال میں چین کے اصنافِ سخن کا عکس بھی ہمارے

ملنے لگا ہے۔

عظمت اللہ خاں نے صرف مغرب کے اثر کے نمایندے ہی نہیں۔ انھوں نے غالباً حالیؔ کے بعد سب سے زیادہ ہمارے شعرا کے طرز کو ہندی سے قریب کیا ہے۔ مقبول حسین احمد پوری، اندرجیت شرما، حفیظ، ساغر، افسر سب کے یہاں ہمیں ہندی کا گہرا اور رچا ہوا اثر ملتا ہے۔ یہ سب غنائی شاعر ہیں اور گیتوں کے لیے ہندی کے خزانے زیادہ موزوں ہیں۔ ان شعرا سے پہلے بھی ہمارے یہاں گیت اور دوہے تھے مگر پہلے شاعر تفریحِ طبع کے طور پر کہتے تھے۔ اُن کا مقصد محض اپنی قادرالکلامی ظاہر کرنا ہوتا تھا۔ ان شعرا نے غزلوں اور مروجہ نظموں کے برابر گیتوں کو بھی مقبولیت عطا کی اور اس مقبولیت کو فلم اور ریڈیو اور گراموفون ریکارڈ نے اور زیادہ چمکایا اور پھیلایا۔ جب ہمارے فلموں میں اچھے گیت لکھے جانے لگیں گے (آرزو لکھنوی اور حشر کے یہاں بعض اچھے گیت ملتے ہیں مگر عام طور پر ان کا ادبی معیار قابلِ اطمینان نہیں ہے) تو اس سے ہماری شاعری کو بھی فائدہ پہنچے گا۔

۱۹۲۰ء سے تقریباً ۱۹۳۲ء تک کا دور انگریزی ترجموں، گیتوں، تجربوں اور ہندی آمیز نظموں کا دور رہا ہے ۱۹۳۳ء سے لے کر ملک میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوتا ہے اور گزشتہ سات آٹھ سال میں اس نے ہمارے ادب کو اپنے بموں سے خاصا دہلا دیا ہے۔ مگر یہ بم آتش گیر اتنے نہیں جتنے چیخنے والے ہیں۔ Not incendiary but screaming bombs ترقی پسندی کی تحریک، ہر نئی تحریک کی طرح اپنے سوا ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے ورنہ ہمارے ادبی سرمایے میں ترقی پسند عناصر برابر کام کرتے رہے ہیں اور کسی زمانے میں انھیں کوئی کچل نہیں سکا ہے مگر اس غلو اور جوش کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کی وجہ سے ہمارے ادب میں بعض اچھی باتیں آگئی ہیں۔ اس نے ہمیں اپنی موجودہ، قانع اسست رو، نمائشی کی

سی زندگی سے بیزاری سکھائی ہے، اس نے اس قحط سالی کا عکس پیش کیا ہے، جو عشق کو بھی بھلا دے، اس نے ادب میں عوام اور جمہور کے دل میں دھڑکن پیدا کی ہے، اگرچہ بہت کچھ مغرب کی خوشہ چینی کرتی ہے مگر بحیثیتِ مجموعی مغرب سے ہم ابھی بہت کچھ لے سکتے ہیں، اس نے سیکڑوں بے زبان لوگوں کو بولنا اور لکھنا سکھایا ہے۔ اس نے گھر گھر ادیب اور شاعر پیدا کر دیے ہیں۔ اس نے اپنے طور پر اردو ادب کو پھیلانے میں حصہ لیا ہے، اس نے ایک جذبے، جوش اور تصور کی وحدت سے مدد لے کر، شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید کی دنیا میں بہت کچھ اضافے کیے ہیں مگر انصاف کا تقاضا ہے کہ اس تحریک کے بعض علم برداروں میں بڑی سطحیت، بڑی رعونت، بڑی تنگ نظری، بڑی قطعیت ہے۔ یہ زندگی کو سیاسی فارمولوں اور اقتصادی اصولوں کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ اب سے دس سال پہلے جو کچھ لکھا گیا ہے اسے حرفِ غلط کی طرح مٹانا چاہتے ہیں اور یہ ایک اچھے ادیب کے منصب کے خلاف ہے۔ یہ ایک ذہنی غلامی سے نکال کر دوسری ذہنی غلامی میں انسان کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں، یہ فن سے ناواقفیت کو آرٹ سمجھتے ہیں اور طوائف کو ہیروئین، یہ مذہب، اخلاق اور تہذیب کو آثارِ قدیمہ کہتے ہیں اور مارکسزم کو انسانیت کا حرفِ آخر۔"

ہر تحریک اپنے پیرووں سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس تحریک کو چلانے والوں میں مبلغ، نقیب، نعرہ لگانے والے، بہت ہیں، ایسے لوگ کم ہیں جو پروپیگنڈے اور آرٹ کے فرق کو جانتے ہوں۔ یہ چیز ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔

اقبال کے بعد ہماری جدید شاعری میں لوگ جوش کا نام لیتے ہیں۔ وہ فطرت کے عاشق ہیں مگر فطرت کا کام اُن کے محبوب کے لیے پھولوں کی سیج تیار

کرتا ہے۔ اُن کی نظموں میں صبح و شام، برسات اور چاندنی رات، مے کدے کی رات، گلستاں کی صبح کی بڑی دل کش تصویریں ملتی ہیں۔ اُن کی تشبیہات جان دار، پُرشکوہ اور حسین ہیں، مگر ان کا عشق بازاری، اُن کے جذبات شہوانی اور اُن کا فلسفۂ زندگی رندانہ اور بوالہوسانہ ہے۔ انھوں نے اپنی بیشتر نظموں کا مجموعہ ۱۹۳۵ء کے قریب مرتب کیا، اس لیے یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کب ان کی رندی کی محفل میں انقلاب کی صدا پہنچی۔ اچانک یا تو قاضی نذرالاسلام کی نظموں کے ترجموں سے متاثر ہو کر یا اقبال کے اُن خیالات سے جو پیامِ مشرق، زبورِ عجم اور جاوید نامہ میں ملتے ہیں۔ جوش انقلاب کے ترانے گانے لگتے ہیں۔ کسان، مزدور، قلی، مہترانی، جامن والی، اگرمی اور دیہاتی بازار، شباب کے نعرے اور بغاوت کے دعوے، نقش و نگار کے بعد ہر مجموعے میں مل جاتے ہیں۔ ان نظموں میں بڑا جوش اور زور ہے، یہ بڑے خلوص سے لکھی گئی ہیں۔ مگر ان میں خیال کی گہرائی ناپید ہے۔ ان میں خطابت کا دم خم زیادہ ہے۔ وہ شعریت کم ہے جو اپنی ابدیت کی خاطر غم و غصّے کی آندھی کے بجائے گدازِ قلب کی دھیمی آنچ کو پسند کرتی ہے۔ پھر ان کی شاعری میں اُن کی شخصیت اور زندگی کی طرح علیحدہ علیحدہ خانے ہیں۔ ابھی وہ رند ہیں اور مے کدے میں دادِ عشرت دے رہے ہیں اور ابھی کفر و ایمان کی ہڈیاں چبا ڈالنے کا عزم کر رہے ہیں۔ ابھی مشیت اور خدا کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں اور ابھی حسینؑ اور انقلاب کے عنوان پر مرثیہ لکھ رہے ہیں۔ وہ انقلاب اور رندی کو ملانا چاہتے ہیں حالاں کہ دونوں میں ایک ازلی تضاد ہے۔ رند انقلابی نہیں ہوتا، نہ انقلابی رند ہونا گوارا کر سکتا ہے۔ جوش خیالات انقلابی رکھتے ہیں اور مشرب رندانہ۔

جوش کے اثر سے رندی، عریانی، تشبیہات کی فراوانی، جذبات کا ایک

طوفان، مذہب پر تمسخر، اخلاق سے بیزاری، موجودہ شاعری میں کافی راہ پاگئی ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ اُن بچّوں کی طرح جو ہر وقت اس ڈر کے مارے کہ کوئی انھیں چپت نہ لگا دے، خود مار پیٹ پر آمادہ رہتے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں جو رعونت ہے وہ ایک احساسِ کمتری کی بنا پر ہے۔ کاش یہ کم ہو جائے تو ایک اچھا توازنِ ذہنی قائم ہو سکے۔

جنگِ عظیم کے بعد غزل بھی بدلی ہے، اُس نے نظم سے بہت کچھ لیا ہے مگر وہ تین شعرا ایسے ہیں جو زمان و مکان سے آزاد ہیں۔ فانی، اصغر، جگر کا نام اس سلسلے میں لیا جا سکتا ہے۔ فانی کی شاعری میں جو المیہ رنگ ہے اس کی یکسانی کی وجہ سے بعض لوگ اُن کی عظمت سے انکار کر دیتے ہیں۔ انھوں نے انھی علامات و اشارات سے آخر تک کام لیا جو اُن کے پیش رو برتتے تھے۔ غزل کے اسلوب میں اتنی تہوں اور قدیم علامات کے ستّر پردوں کے باوجود فانی کی شاعری ایک ایسا حسن، ایک ایسی جوانی اور ایک ایسی چمک دمک رکھتی ہے جو حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے دکھا دیا کہ میر کے قریب ہونے کے لیے فانی کے راستے سے بھی گزرنا ضروری ہے۔ فانی کے اشعار میں جو مجبوری و بیچارگی، جو پامالی و خستگی ملتی ہے وہ اگرچہ ذاتی معلوم ہوتی ہے مگر کون جانے اس میں اجتماعی زندگی کی کتنی محرومیاں اور ماحول کی کتنی تلخیاں ملی ہوئی ہیں۔ اصغر کے یہاں غالب و مومن کا امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے اس دنیا کے حسن کو اس دنیا کی زبان میں پیش کیا ہے، انھوں نے ہر جامِ آتشیں میں مہ و انجم دیکھے اور دکھائے ہیں اور "ہر شیشۂ مے کو ثریا" بنایا ہے۔ حسن کا یہ پجاری حسنِ نسوانی کو بھی حسنِ آسمانی بنا کر پیش کرتا ہے، پروانے کی دنیا جس کی خاکستر میں اقبال کو "تعمیرِ سحر" کے لیے چنگاریاں ملتی ہیں، اصغر کے نزدیک حسن کی دنیا ہے، اس میں شمعِ شبستان کے انداز سارے کے سارے خوب ہیں۔ ان کی ہلکی، لطیف مترنم اور شاداب لَے

ہمیں کچھ دیر تک مستی اور ہشیاری کے درمیان جھولا جھلاتی ہے مگر اقبال سے کچھ متاثر ہونے کے باوجود ہم اُن میں اپنے دور کی کوئی خاص علامت نہیں پاتے اور نہ یہ علامت ہم جگر میں پاتے ہیں۔ جگر کی غزل میں جوانی کا نشہ ہے، اس جوانی کا جو بدمست ہوتی ہے، گرد و پیش سے بے نیاز ہوتی ہے، سرتاپا جذبہ ہوتی ہے، شاہد و شراب کے لیے وقف ہوتی ہے۔ غرض ان کے یہاں ہمیں بہت دن تک وہ شاعری ملتی ہے جو عنفوانِ شباب کی ہے اور اپنی تیزی و تندی کی وجہ سے جوانوں اور بوڑھوں سب کو متاثر کرتی ہے، مگر جب جگر ہوش میں آتے ہیں تو اُن کا وہ نفسیاتی شعور جو ان کی سرمستی بلکہ بدمستی میں کچھ خوابیدہ سا تھا بیدار ہو جاتا ہے اور اس کے بعد انھوں نے وارداتِ قلبیہ کی ایسی ایسی تصویریں کھینچی ہیں کہ اُن میں ہر دل کی تصویر آگئی ہے۔ انھوں نے حسن کا محض وہ مفہوم چھوڑ دیا ہے جو "سینۂ شفاف" اور "زلفِ پریشاں تا کمر" تک محدود تھا اور اُن کا وہ عشق بھی اب کچھ بدل سا گیا ہے جو اپنی نارسائی کا انتقام ایک مفروضہ تفوق سے لیا کرتا تھا، بلکہ اب اُن کے یہاں حسن و عشق دو پُراسرار، گہرے اور اتھاہ سمندر ہیں جن کی تہ سے موتی نکالنا اُن کا محبوب مشغلہ ہے اور جن کی چہک جنگ اور گرانی کے باوجود باقی ہے۔

ان غزل گو شعرا پر تو زمانے کا اثر زیادہ نہیں مگر دوسرے اس سے بچ نہیں سکے ہیں۔ آرزو کو سادگی عزیز ہے تو اس وجہ سے، افسر اور حفیظ کی غزلیں، غزلیں کاہے کو ہیں گیت ہیں مگر ان میں میر و دورِ آخر کے غالب کی سادگی نہیں، بیسویں صدی کی سادگی ہے جو پُرکار نہ سہی "تازہ کار" ضرور ہے اسی زمانے کا اثر فراق کی غزلوں میں بہت کچھ نمایاں ہے۔ یہ شخص فانی کا سا المیہ احساس رکھتا ہے مگر جدید ذہن ہر سلسلے میں جو الجھن اور ہر الجھن میں جو سلسلہ دیکھتا ہے اور جو اجتماعِ ضدین پاتا ہے وہ انھیں فانی کے رنگ سے بچا کر ایک اور وادی میں لے گیا۔ فراق ہمارے ان شعرا

میں سے ہیں جو مغربی سانچوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ مگر اس سے اُن کی مشرقیت اور گہری ہوگئی ہے۔ اُن کے خیال میں آپ کو بڑی گہرائی ملے گی، اتنی گہرائی کہ ان کی زبان اکھڑی اکھڑی اور اُلجھی اُلجھی سی معلوم ہوتی ہے، نیا ز فتح پوری کو ان کی پختگی سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ میں ان کی پختگی کا منتظر ہوں۔

نوجوان شعرا میں اگرچہ سبھی نے غزلیں کہی ہیں مگر مجھے فراق کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ اگلے بیس سال زیادہ تر نظم کے سال معلوم ہوتے ہیں۔ موجودہ غزل اقبال کے اثر سے زیادہ عالمانہ ہوگئی ہے۔ عالمانہ سنجیدگی اور شاعرانہ شگفتگی کا توازن یوں ہی بہت مشکل ہے۔ چہ جائیکہ غزل میں، عالمانہ پختگی سے ہٹ کر یہ گیت کی طرح ہلکی پھلکی اور سیدھی سادی اور بے تکلف ہوگئی ہے، اور یہ بھی اس کے لیے ایک خطرہ ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ نوجوانوں میں جن کی عمر ۲۵ اور ۳۰ کے درمیان ہے صرف جذبی ایسے معلوم ہوتے ہیں جو اچھے غزل گو کہے جاسکتے ہیں مگر یہ شاید اس وجہ سے کہ اُن پر فانی کا خاصا اثر ہے۔

آزاد انصاری، اثر لکھنوی اور جوش ملیح آبادی نے مسلسل غزلیں بھی بکثرت لکھی ہیں اور اُن کا مقصد غزل اور نظم کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنا ہے۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں اور تمام اساتذہ کے یہاں مسلسل غزلیں اور قطعہ بند اشعار مل جاتے ہیں مگر ایک مسلسل تحریک کی حیثیت سے یہ روش زیادہ مقبول نہیں ہوئی بلکہ اقبال نے غزلوں میں نظموں کے مضامین جس خوبی سے برتے اس کا اثر ہوا اور اب نظمیہ غزلیں یا غزلیہ نظمیں کافی مل جائیں گی۔

اس وقت نظم پر اقبال اور جوش کا اثر ہے۔ غزل پر میر اور حالی کا اقبال کا بھی۔ غالب کا وہ رنگ جس کے معنی خوش نما ترکیبوں اور ناقابلِ فہم تشبیہوں کے تھے ترک کر دیا گیا۔ غالب کے خیال کی تقلید اب بھی کی جاتی ہے۔ میر بھی مقبول

ہو رہے ہیں اور وہ الفاظ جو ناسخ نے ترک کر دیے تھے پھر رائج ہونے لگے ہیں۔ پیارے، آئے ہیں، جائے ہے کی ردیفیں پھر عام ہو رہی ہیں۔ سادہ اور مترنم بحریں پسند کی جاتی ہیں۔ اقبال کے اثر سے خودی، فلسفۂ زندگی، جہاد، میدانِ عمل، جیسے الفاظ بہت استعمال ہونے ہیں، شاعر اور فلسفی کا موازنہ بہت ہونے لگا ہے مگر اقبال کے اثر کے باوجود انگریزی کا اثر اب بھی گہرا ہے مگر اب دوسرے ملکوں کی شاعری کے نمونے بھی ملنے لگے ہیں۔ چینی، جاپانی، ترکی، فرانسیسی، جرمن، ادب کے شہ پارے ترجموں کی شکل میں نظر آجاتے ہیں۔ زبان، قواعد، صنعتوں سے لگاؤ کم ہوتا جاتا ہے۔ نئے شاعروں کو ابھی کم سے کم الفاظ سے زیادہ سے زیادہ کام لینا نہیں آیا۔ اکثر نظموں میں بے ضرورت اشعار بہت ہوتے ہیں جس تعمیر کا علم بہت کم لوگوں کو ہے۔ اس دور کی شاعری پر عورت بری طرح سوار ہے۔ بعض ترقی پسند شعرا، جو ادب کو پناہ گزینی سے نجات دلانا چاہتے ہیں، نظمیں ایسی لکھتے ہیں جن میں زندگی سے فرار نمایاں ہے۔

ایک عالم گیر جنگ سے دوسری عالم گیر جنگ تک کے زمانے کو upton sinclair نے Dragons Teeth اژدہوں کی تخم ریزی کا زمانہ کہا ہے۔ اس درندگی کے آثار ہماری شاعری میں بھی مل جاتے ہیں۔ حرکت، ہیجان اور ہنگامہ اس زندگی کا لازمی جز ہے۔ اب دریا کنارے بیٹھ کر شغلِ مے نوشی نہیں ہوتا۔ تصوّف اب صرف فانی، اصغر یا امجد حیدرآبادی یا اثر صہبائی کے یہاں ملے گا۔ ماحول سے بیزاری بڑھتی جاتی ہے جو سیاسی حالات کا نتیجہ ہے مگر زندگی کو سمجھنے اور اس سے کچھ حاصل کرنے کا ولولہ کم نہیں ہوا۔ دو جنگوں کے درمیان کی شاعری عام طور پر تنوّعی ہے۔ محبت اور ستاروں کا نغمہ بھی اس بے حلق میں پھنس جاتا ہے۔ اس میں اقبال اور جوش کی امید پروردہ جاتی اور

بیدار شاعری، ایک اکیلے ستارے کی طرح روشن ہے۔ اُردو شاعری کی پرانی علامات اب بھی کارآمد، مفید اور رجائیت ہیں مگر دو آنے کچھ اکتا سی گئی ہے اور بدلتے ہوئے حالات میں اپنے آپ کو بدلنے کے لیے آمادہ نظر آتی ہے۔ وہ دہلی اور لکھنؤ کے چکّر سے نکل چکی ہے اور اب ہندستان سے بھی آگے کبھی روس کے خونیں شفق پر نظر جماتی ہے، جہاں اشترا کیت اور نازیت کا خوف ناک اور پر ہیبت تصادم ہو رہا ہے اور کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں اور برما اور ملایا کے پُر اسرار جنگلوں کو دیکھتی ہے، جہاں حالات سے مجبور انسانوں کے ساتھ وقت کا جابر ہاتھ آنکھ مچولی کھیل رہا ہے مگر اس کا دل ہندستانی ہے۔ ہمارے سیاست داں مصلحتوں کے چکّر میں گرفتار ہیں۔ ہمارے عالم اپنے عہدوں اور اختیارات کو بڑھانے میں مصروف ہیں۔ مگر مظلوم، غلام، جاہل مگر نیم بیدار ہندستان کی روح کی ترجمانی ہمارے شاعر کر رہے ہیں جو اگرچہ خود بہت کچھ نہیں کرتے مگر پھر بھی ہندستان کو اس کے اصل خط و خال تو دکھا دیتے ہیں، یہی کیا کم ہے

یار پیمانے اگر کر گئے خالی غم کیا
اب بھی ابر آتا ہے اور خم میں شراب اور بھی ہے

(آل احمد سرور)

تمہید

دُنیا کی تاریخ میں بیسویں صدی کئی حیثیتوں سے ممتاز ہے۔ اس سے پہلے کوئی صدی دُنیا بھر کے لیے یکساں حالات، یکساں خیالات اور یکساں مصائب نہیں پیش کر سکی۔ پوری دُنیا اس صدی میں ایک واحد تمدن کی طرف حرکت کر رہی ہے۔ سیاسی اور معاشی تحریکیں اب صرف چند خاص جغرافیائی خطّوں تک محدود نہیں رہیں، ان کا اثر کم وبیش دنیا بھر میں محسوس ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دُنیا کے ہر ملک کا ادب دوسرے ممالک کے ادب سے اور اُن کے تمدن سے متاثر ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ردِّ عمل کی کوششیں اور تحریکیں بھی جاری ہیں۔ ہر ملک ایک طرف تو دنیا کے دوسرے ممالک کی ادبی تحریکوں اور ادبی شاہکاروں سے متاثر ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے ماضی کے خزانے پھر سے ڈھونڈ رہا ہے۔

بیسویں صدی کی اُردو شاعری بھی اس صدی کی دُنیا بھر کی شاعری کا ایک ایسا جز ہے جو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ خیالات، تصورات، تشبیہات سب میں وہ خصوصیتیں پیدا ہو گئی ہیں جو دوسرے ممالک کی اس صدی کی شاعری میں موجود ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی تحریکیں ہندستان میں مردہ ہو کر پہنچتی ہیں پھر بھی بعض اعلیٰ دماغ اور بلند خیال اُردو شاعروں کے شاہکار اس صدی کی دُنیا بھر کی بہترین نظموں میں گنے جا سکتے ہیں۔ اس مجموعے کا معیار میں نے یہی قرار دیا کہ صرف ایسی نظمیں شامل کی جائیں جو کسی نہ کسی طرح بیسویں صدی کے خیالات کا مظہر ہوں (یا اُن کا ردِّ عمل پیش کریں) اور نظموں کا یہ معیار ہو کہ اگر کسی غیر زبان

ہیں ترجمہ کی جائیں، تب بھی زبان سے قطع نظر، ایک خاص چیز ہوں۔

غدر ۱۸۵۷ء کی شکست، ایک حد تک ہندستانی (قرونِ وسطیٰ کے) تمدن کی شکست بھی، جس طرح ہندستانیوں نے اقتصادی اور سیاسی ضروریات کے تحت انگریزی سیکھنا اور بڑی حد تک مغربی تمدن کی خاص خاص چیزوں کو اختیار کرنا ناگزیر سمجھا اسی طرح اُردو ادب اور شاعری نے بھی اسی طرح کی تبدیلی کی ضرورت سمجھی۔ معاشی حالات کا اثر معاشرت پر اور معاشرت کا اثر ذوق اور فنون پر پڑتا ہو چنانچہ محمد حسین آزاد کی نیم پختہ و نیم خام اور حالی کی پختہ تر کوششوں نے اردو شاعری کا رُخ بالکل بدل دیا اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری کے رسوم کہن کئی شکلوں میں باقی رہے۔ بہت سے شاعروں نے غزل کی ڈگر نہیں چھوڑی، اور اب بھی ایسے غزل گو شعرا موجود ہیں جو میر اور آتش، امیر اور داغ کے پرانے اسلوبوں کو نباہ رہے ہیں۔ لیکن یہ ضروری ہو کہ امیر و داغ کے جانشینوں کا جو قدم اٹھتا ہو وہ تنزل کی طرف اٹھتا ہو۔ اس قسم کی تنزل پذیر شاعری ہمیشہ کم زمد ہوتی جاتی ہو اور قدرتی موت مرتی ہو۔

جہاں تک صحتِ خیالات اور ذہنی جدّت کا تعلق ہو غزل کی جو اصلاح غالب اور اُن کے بعد حالی نے کی تھی، اس کا بھی سلسلہ جاری رہا۔ بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں اقبال کی غزلیں اسی قسم کی ہیں۔ ان جدید طرح کی غزلوں پر مغرب کے اسالیب اور خیال نے اثر ڈالا اور اس کے ساتھ مشرق کی والہانہ رسمِ اُلفت اور متصوفانہ مشرب نے مل کر ایک خاص رنگ اختیار کیا۔ اس رنگ میں چند شاعروں (شاد، حسرت، جگر، فانی، اصغر وغیرہ) نے فلسفیانہ مضامین بھی باندھے، اگرچہ فلسفیانہ اشعار کا موضوع زیادہ تر فلسفۂ غم اور بے ثباتیِ دنیا ہو۔ ہندستان اور خصوصیت سے ہندستانی مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی حالت اس رنگ کی شاعری کی ذمہ دار ہو۔ مفلسی کا ناکام عشق، بیماریاں، وبائیں اور موت؛ عزیزوں کی موت کا اثر خاندان

کی معاشی حالت پر۔ یہ وہ چھپی ہوئی طاقتیں ہیں جو اُردو کی پرانی رسمِ شاعری کی مدد سے، اور جدید خیالات کی چاشنی کے ساتھ "جدید غزلوں" میں نظر آتی ہیں۔ اقبال کی غزلیں اگو شاعری کے نقطۂ نظر سے کم رُتبہ اخیالات کی حد تک ان سے مختلف ہیں، جس کی وجہ غالباً اقبال کی صاف بیانی ہے۔ جب مصیبت اٹھائی تو اقبال نے اپنے فقر پر کھلم کھلا فخر کیا۔ اور وہ خود ہوئے ہوں یا نہ ہوں مگر ان کی شاعری اُس طرح کے عشق میں کبھی نہیں گرفتار ہوئی جو رودکی سمرقندی کے زمانے سے لے کر فانی اور حسرت کے دور تک ترکی اور ایران اور مسلمان ہندستان کی شاعری اور ادب پر حکومت کرتا رہا۔

ادب میں، فنونِ لطیفہ میں، اور سب سے زیادہ شاعری میں گزشتہ دو تین سو سال کے عرصے میں ساری دُنیا کی رہنمائی یورپ نے کی ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں پہلے تو سیاسی۔ یورپ ساری دنیا پر پھیل چکا ہے اور دُنیا کے دور دراز اور کم معلوم ترین گوشے مغربی تمدّن سے اچھی طرح آشنا ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ سیاسی وجہ صرف یورپی اثرات کی اشاعت میں مدد دیتی ہے۔ یورپ کی شاعری کی مقبولیت کا باعث ایک اور چیز ہے جس کو اگر قوتِ حیات (Vitality) کہا جائے تو بجا ہوگا۔ یہ ڈائنا میٹ کی سی طاقت جس میں تعمیر اور تخریب دونوں خصوصیتیں موجود ہیں لیکن جس کا مقصد زندہ رہنا اور اپنے آپ کو زندہ محسوس کرنا ہے، یورپ کے تمدّن کی خصوصیتِ عالیہ ہے۔ اسی نے جدید سائنس کی بنیاد ڈالی، اسی نے فلسفے کا رُخ نظریات سے بدل کر تجربات کی طرف کر دیا، اسی نے تاریخ کی سچی تحقیق شروع کی، اسی نے نفسیات اور نفسیاتِ تحلیلی کا پتا چلایا، اسی نے ستاروں کی گردش کے راز دریافت کیے، اسی نے زمین کی کشش محسوس کی، اسی نے پہلی مرتبہ بے خوف و خطر مذہب اور پرانی روایات کے خلاف زبان کھولی (اگرچہ اس سے پہلے بھی

لوگوں نے ڈرتے ڈرتے شک کرنے کی کوشش کی تھی) اسی نے سیاست اور معاشیات کے اصول مرتب کیے۔ اور ایک نئی طرح کی شہنشاہیت — تجارتی شہنشاہیت — سے ساری دنیا پر حکومت کی۔ اسی نے سرمایہ داری کی بنیاد ڈالی اور پھر اس کی تلخی محسوس کر کے اسے جڑ بنیاد سے اکھیڑ ڈالنا چاہا۔ یہ قوتِ حیات مختلف پیرایوں میں مختلف لوگوں اور مختلف قوموں کو ملی۔ لیکن اہلِ یورپ اس لحاظ سے خوش قسمت رہے کہ انھوں نے اسے سب سے زیادہ استعمال کیا۔ یہی قوتِ حیات ان کے ادب، ان کے فنون اور ان کی شاعری کی جان ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یورپ کا ہر ملک اس قوت کا تماشا ایک نئے زاویے سے دکھاتا ہے۔ صرف فنونِ لطیفہ کو لیجیے۔ انگلستان، جرمنی، فرانس اور اطالیہ کی موجودہ شاعری (باوجود باہمی اثرات اور مشترک تحریکات کے) بالکل جدا جدا طور پر زندگی کی قوتوں، زندہ جذبات اور دماغی اور ذہنی اثرات کو پیش کرتی ہے۔

انیسویں صدی کے اردو شاعروں میں سے جن جن نے جدید طرز پیدا کرنے کی کوشش کی، صرف انگریزی شاعری کی (جس کو وہ غالباً اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے تھے کیوں کہ اس کے ماحول سے ناواقف تھے) پیروی کی۔ بیسویں صدی میں یہ بات نہیں رہی، بہت سے شعرا انگریزی کے علاوہ دوسری زبانیں بھی جانتے تھے۔ مثلاً اقبال اور عبدالرحمان بجنوری وغیرہ جو نہیں بھی جانتے تھے انھوں نے دوسری زبانوں کے شاہ کاروں کے انگریزی ترجمے پڑھے۔ لفظۂ نظر وسیع ہوتا گیا۔ خصوصاً جنگِ عظیم کے زمانے میں جو ذہنی احساس پستی انگریزی شوکت (اور ادبی لحاظ سے اُن کے ادب) کے مقابل محسوس ہوتا تھا وہ اس طرح کم ہونے لگا کہ یورپ کی دوسری قوموں کی عظمت اور تمدّنِ جدید کی تشکیل میں ان کا حصہ بھی سمجھ میں آنے لگا۔ اپنے ماضی کی عظمت کے افسانے جو حالی نے دہرائے تھے اقبال کی آواز میں کبھی نعرۂ جنگ بن گئے اور کبھی ترانہ۔ اس طرح

جدید اثرات کی بے بصر تقلید نہیں کی گئی اور نہ اُن کی غلط اشاعت ہوئی۔ یہ تحریکیں جب ہندستان پہنچیں تو انھیں ہندستانی رنگ میں رنگا گیا۔ جہاں انھوں نے مشرق کے آدابِ قدیمہ سے پرخاش کی کوشش کی تو کبھی اُن کا مذاق اڑایا گیا (اکبر)، کبھی صحیح یا غلط فلسفیانہ استدلال سے ان کو غلط قرار دیا گیا (اقبال)۔ ان کوششوں سے ایک فائدہ تو ہوا، اُردو شاعری میں استدلال، فلسفیانہ مباحث، ذہنی سرگرمی کے راستے کھل گئے۔ جب انگلستان کے سوا دوسرے ملکوں کے اثرات قبول کرنے کو ہماری شاعری تیّار ہو گئی تو یہ اثرات صرف یورپ تک محدود نہیں رہے۔ جاپانی نظموں کے ترجموں سے اخذ کر کے بجنوری مرحوم نے دو تین نظمیں لکھیں۔ جن شعرا میں صلاحیت تھی، اور اُنھیں مواقع حاصل تھے، انھوں نے اپنی نظموں میں پرانی ہندی کی چاشنی دے کر عجب طرح کا رنگ پیدا کیا، اور ان نظموں سے بعض اُردو میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ مثلاً عظمت اللہ خاں مرحوم کی نظمیں، ہاشمی صاحب کی "کالی ناگن"۔ بجنوری مرحوم کی "صُبحِ بنارس"۔ ایران اور اسلامی ممالک کی شاعری سے عشقیہ جذبات اور پامال ترکیبیں اور تشبیہیں مستعار لینے کے بجائے اقبال نے فارسی شاعری کی استعدادِ ذہنی و دماغی سے خوشہ چینی کی۔ مشرق کی ثقہ سنجیدہ شاعری اور مغربی خیالات کے سنگم پر ایسی نظمیں نمودار ہوئیں جن پر اس صدی کی اُردو شاعری بجا طور پر فخر کر سکتی ہے جیسے اقبال کی اکثر نظمیں، ہاشمی کی "سراغِ مہم" وغیرہ، شاد عظیم آبادی کا مستزاد "کچھ کہہ نہیں سکتا"۔

آرٹ کے تصوّرات جب پہلے پہل اُردو ادب کے سامنے آئے تو اُن کا اثر بھی ایک طرح کا معمہ بن گیا۔ بہرحال شاعری پر آرٹ کے اثر کے دو نتیجے ہو سکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ ایسی نظمیں لکھی جائیں جن میں دوسرے فنونِ لطیفہ کے شاہ کار، یا حسنِ نسوانی (سراپا کی ایک جدید اور بدلی ہوئی شکل) کی تصویر کھینچی جائیں۔

دوسری یہ کہ ایسی نظمیں لکھی جائیں جو آرٹ کا مکمل نمونہ ہوں۔ ان تحریکوں کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی جتنی مقبولیت آج کل مکعب نما مکانات کو حیدرآباد میں حاصل ہے۔ ان دونوں تحریکوں سے اُردو شاعری کو باقاعدہ طور پر روشناس کرانے کا سہرا بجنوری مرحوم کے سر ہے "نٹ راجا"۔ جو شیوجی کے رقصِ تخریب پر لکھی گئی ہے۔ اپنے نامانوس اور دقیق الفاظ کے ہجوم معنی سے اور اپنی بحر کے ذریعے جو پہلے پھیلتی ہے، پھر دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں سمٹ جاتی ہے اور پھر پھیلتی ہے، رقص کے اس مجسمۂ سنگ کی بیک وقت ناقابلِ فہم اور ٹھوس اور پھر متحرک و متلاطم کیفیات کی سرگزشت، شاعری کے ذریعے دہراتی ہے۔ بجنوری مرحوم کی "ناہید" اگرچہ خرائے بزرگ میں لکھی گئی لیکن اس کا موضوع غالباً شکستہ دست زہرہ۔ Venus de Milo ہے۔ یہ نظم اس کوشش کی ناکامیابی کی دلیل ہے جو ایک فنِ لطیف کے شاہکار کو دوسرے فن کے ذریعے دہرانے میں کی جاتی ہے۔ شاعری سنگ تراشی کا کام نہیں کر سکتی۔ سنگ تراشی مصوّری کی خصوصیات نہیں پیدا کر سکتی۔ بجنوری نے اس نظم میں میکائیل آنجلو کے اس خیال کو ادا کرنا چاہا ہے کہ "مجسمہ پتھر کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے، سنگ تراش کی نظر اور اس کا اوزار مرمر کی نقاب کو توڑ دیتا ہے" اس خیال کو انھوں نے پوری نظم میں ادا کرنا چاہا ہے لیکن چوں کہ ایک ہی شعر میں اصلی خیال ادا ہو گیا۔ اس لیے باقی حصّہ محض حاشیہ بن کر رہ گیا ہے وہ ایک شعر یہ ہے ؎

سنگ میں سو رہی تھی وہ، جیسے شکم میں طفل ہو
سن کے صدائے تیشہ کو خوابِ گراں محال تھا

اس کے بعد کا یعنی نظم کا آخری شعر ؎

روح تصوّرِ نہاں، جسم تھا صورتِ عیاں
حسن حیاتِ جاوداں ان کا باہم وصال تھا

پوری نظم کی تغلیط کرتا ہے۔ کیوں کہ میکا ئیلی آنجلو کے ساتھ بجنوری مرحوم بھی تصورِ نہاں کو جسم قرار دے چکے تھے جو پتھر ہی میں پوشیدہ رہتا ہے۔ تصور اور صورت اس طرح ایک ہوجاتے ہیں اور عیاں اور نہاں کا فرق باقی نہیں رہتا۔ دوسرا مصرع بالکل مہمل ہوجاتا ہے

فنِ لطیف کے ایک شاہ کار (مسجدِ اقصےٰ قرطبہ) پر سب سے کامیاب نظم اِس صدی میں نہ صرف اُردو شاعری میں بلکہ جتنی زبانوں کی جدید نظمیں مجھے پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے اُن سب میں، اقبال نے لکھی ہے۔ وقت کو روز و شب یعنی نور و ظلمت کے ایک گزرتے ہوئے سلسلے سے تشبیہ دی ہے، وقت ہر چیز کو، ہر فن کو، ہر مصنوع کو مٹا دیتا ہے لیکن ؎

ہے مگر اس نقش کو رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

اس کی وجہ یہ ہے کہ مردِ خدا کا "عمل" "عشق سے صاحب فروغ" ہے عشق، اعلیٰ ترین معنوں میں ہر فن کی، ہر آرٹ کی، ہر صنعت کی اصل ہے۔ عشق جس قدر پختہ، جس قدر بلند ہوگا اسی قدر وہ مصنوع بھی پُرشوکت ہوگا (جامع قرطبہ کی بہت سی مسجدیں، یورپ کے عظیم الشان کلیسا، ہندستان کے لاثانی مندر اس کے گواہ ہیں) اگر عشق لازوال ہو تو پھر مصنوع بھی لازوال ہوگا۔ یہاں نظم بحث کا ایک اور درجہ طے کر کے اس نتیجے پر پہنچتی ہے۔

اے حرمِ قرطبہ، عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
تیری فضا دل فروز میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود۔

آرٹ کا وہ شاہ کار بھی لازوال ہو جس کی بنیاد لازوال عشق پر ہو، کیوں کہ اس کو دیکھ کر یہی جذبۂ عشق اس شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہو جس کا اُس شاہ کار سے کوئی ذہنی یا جذباتی تعلق ہو۔ "دلوں کا حضور" پیدا کر کے مسجد لازوال ہو گئی ہی، کوئی زلزلہ اُسے مٹا نہیں سکتا۔ دلوں میں وہ ایک جذبہ پیدا کر دیتی ہو اور اُس جذبے کی طرح خود بھی لافانی ہو جاتی ہو۔ یہ وہی جذبہ ہو جو پھر اُسی عشق اور اس عشق سے گرمائے ہوئے نشاۂ ثانیہ کے لیے دلوں کو گرماتا ہو ؎

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی　　دیکھ رہا ہو کسی اور زمانے کا خواب

فنونِ لطیفہ کا دوسرا اثر اُردو شاعری پر یہ ہوا ہو کہ چھوٹی چھوٹی نظموں میں وہ تناسب، رنگ یا ایسی اور خصوصیتیں پیدا کی گئی ہیں جو دوسرے فنونِ لطیفہ میں پائی جاتی ہیں۔ بجنوری مرحوم کی نظم "اجنبی" اس کا ایک نمونہ ہو۔ اسی طرح کی ایک نظم جوش ملیح آبادی کی "کوہستانِ دکن کی عورت" ہو۔

ساتھ ہی ساتھ ایسی نظمیں بھی لکھی گئی ہیں جو بجائے خود شاعرانہ آرٹ کا مکمل نمونہ بننے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان نظموں میں تفصیل و صراحت کی گنجایش نہیں ہوتی۔ تشبیہیں یا تو استعمال ہی کم کی جاتی ہیں یا بیان کا کام دیتی ہیں۔ اس مجموعے میں اس نوع کی بہترین مثال غالباً بجنوری مرحوم کی نظم "صبحِ بنارس" "جوگی کی صدا" ہو۔ جوش کا "بدلی کا چاند" کچھ اسی طرزِ ادا کی ضیا باری کرتا ہو۔ "بجنوری مرحوم کی وفات" پر ہاشمی فرید آبادی نے جو نظم لکھی ہو یہی خصوصیت اس میں بھی پائی جاتی ہو۔ سجاد حیدر یلدرم نے "شملہ کالکا ریلوے پر ایک نظارہ" دیکھ کر اس کو اسی طرح ادا کرنے کی کوشش کی ہو۔ یہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ اس طرح کی نظمیں جو ختم صدی (Fin de Siecle) پر فرانس اور انگلستان میں مقبول تھیں، اور پھر ان کی مقبولیت دنیا بھر میں پھیلنے لگی۔ آمد سے زیادہ آورد کا نتیجہ ہیں۔

نہیں بلکہ اصل میں اُن کا بنیادی جذبہ قدرتی ہوتا ہے۔ آمد ان کی بنیاد ہوتی ہے مگر شعر کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے صنّاعانہ صلاحیت اور صنّاعانہ استعداد کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔

ہندستانی اثرات، سیاسی اثرات سے وابستہ ہیں۔ جذبات کی حد تک یہ تین قسم کے ہیں:- (۱) آزادی کے جذبات۔ ان کی شاعری کبھی صاف صاف اور کبھی کھلم کھلا سامراج کے خلاف ہے۔ اقبال کی شاعری میں وہ فلسفیانہ رنگ اختیار کرتی ہے اور عمل کی دعوت دیتی ہے۔ جوشؔ کی شاعری محض جوش دکھاتی ہے، اور بعض ایسے شعرا کی شاعری میں جو شاعر سے زیادہ سیاس تھے اور جنھوں نے اس راہ میں بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں، پردوں میں چھپ کے اپنا جلوہ دکھلاتی ہے، ان کے کلام میں عشق (قدیم مشرقی) اور آزادی تقریباً ہم معنی ہو جاتے ہیں مثلاً حسرتؔ موہانی یا مولانا محمد علی کا کلام ؎

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

سیاسی شاعری کی دوسری قسم (۲) ہندو مسلم یک جہتی کی شاعری ہے جس کا نمایاں ترین رہنما مینار "نیا شوالہ" ہے۔ یہ مینار اس قدر خوش نما تھا کہ اقبال خود اس کو منہدم نہ کر سکے۔ قومی شاعری ان دو انواع پر مشتمل ہے۔ وہ ہندستان میں اتحاد کی تلقین کرتی ہے اور آزادی کی دعوت دیتی ہے۔ چکبستؔ نے ایسی شاعری بہت کی مگر ان کی اس قسم کی نظموں میں شاید کوئی ہو جو بہت بلند معیار کی ہو۔ (۳) تیسری قسم اسلامی یا ملّی شاعری ہے جس کے قائدِ اعظم اقبالؔ تھے اور ان کی اس طرح کی شاعری پر اور خود ان پر اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ یہاں کچھ اور لکھنا باعثِ طوالت ہوگا۔

قومی شاعری اور قومی تحریکات کا اثر یہ بھی ہوا کہ ہندستانی موضوعات پر

بھاشا کی چاشنی کے ساتھ نظمیں لکھیں گئیں۔ سرور جہاں آبادی کی نظم "لکشمی جی" میں زبان کی چاشنی کے ساتھ مذہبی عقیدت کا حسن ہے۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کی ہندی آمیز شاعری نے اُردو میں خاص شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ اور بعض نظمیں بہت خوب ہیں۔ "مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا" مجموعی طور پر بہت کامیاب نظم ہے۔ جذبات، ماحول، درد و اثر، زبان، اسلوب، سب کا ہندستان کے ماحول سے تعلق ہے۔ "پیت کی ماری سیتی شاعرہ روپامتی" میں موضوع کی طرح گنگا جمنی لطافت ہے "ترک" اور "ہندو" کے میل کی خصوصیات نظم کے اسلوب میں بھی ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ اس طرح کی نظموں میں ہاشمی فریدآبادی کی "کالی ناگن" بہت دل چسپ ہے۔ ناگن قدیم آریائی (ہندستانی اور یونانی) افسانوں کی ناگن کی طرح عورت بھی ہے اور سانپ بھی۔ یہ ناگن یورپ کے انیسویں صدی کے رومانوی ادب میں بار بار نظر آتی ہے۔ کیٹس کی لامیا (Lamia) اسی شاعر اور یورپ کے عام رومانی ادب کی محبوبۂ طناز و بے رحم (La belle Dame sans merci) کی رشتے کی بہن ہے۔ اسی طرح ہاشمی صاحب کی ناگن بوقتِ واحد ناگن بھی ہے اور عورت بھی ؎

یا ہے وہ امنگ جوانی کی اور باہیں پھیلی ترتی ہے
یا موج ہے بہتے پانی کی اور اچھلی گھلی پھرتی ہے
کچھ شرم ہے کچھ خودآرائی ہے نشۂ مے کی انگڑائی
بن بن البیلی کھلتی ہے، اٹھ اٹھ متوالی گرتی ہے

میں اس تمہید کی ابتدا میں لکھ چکا ہوں کہ اس صدی میں دنیا سمٹ کر بلحاظِ تمدن، علوم و فنون، و ادب ایک ہوتی جارہی ہے اس لیے اردو شاعری کو اس صدی کی دنیا بھر کی شاعری کا ایک جزوِ شامل سمجھنا چاہیے۔

لیکن اس پر بھی جہاں تک زبان، زمان کے سانچوں، ترکیبوں، تشبیہوں، استعاروں، خیالات، جذبات، محاکات کا تعلق ہے، ماضی اور حال کے درمیان موہوم سا خطِ فاصل بھی کھینچنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ ہر دور میں، ہر زبان کے ادب میں دوگونہ عمل ہوتا رہتا ہے، باہر سے تحریکیں آتی ہیں اور زبان و ادب کا جزو بنتی جاتی ہیں، اسی طرح اس زبان اور ادب کے رسوم و روایات میں بھی ارتقا ہوتا جاتا ہے کبھی محسوس، کبھی نیم محسوس، کبھی نامحسوس، طور پر پرانی روایات جدید سے جدید نظم میں برابر گھر کر لیتی ہیں۔ بعض بعض شاعروں کے کلام میں یہ روایات ——— اگر ان کا تعلق ملک سے اور اہلِ ملک یا کسی فرد کے سچے جذبات سے ہو تو ——— بیرونی اثرات کا مقابلہ کرتی ہیں۔ اس مجموعے میں اس قسم کا بہترین نمونہ شوق کی "عالم خیال" کا انتخاب ہے۔ اس نظم میں اگر کوئی چیز جدید ہے تو اس کی حقیقت نگاری ہے جس میں ایک ہندستانی عورت کے سچے جذبات کا تجزیہ اردو شاعری میں بے مثل ہے۔ شوق کی صناعانہ صلاحیت کی تعمیر میں مغربی ادب کے اثرات کا ضرور ہاتھ تھا۔ "قاسم و زہرہ" "رومیو اور جولیٹ" کا چربہ ہے۔ لیکن جب نقل سے گزر کر انھوں نے حقیقت کو ادا کیا تو ان کی شاعری کچھ سے کچھ ہو گئی۔

دو طویل نظمیں اس صدی کی اردو شاعری کے لیے باعثِ فخر ہیں۔ ان میں سے ایک "جوگی اور ناظر" بہت مشہور ہے؛ منظر کشی، الفاظ، نیم مصرعوں اور مصرعوں کی مناسبت اور ان کے باہمی جوڑ، ترکیبوں اور تشبیہوں اور دلیسی رنگ میں مادی اور روحانی زندگیوں کے باہم فرق کا مرقع ——— یہ سب چیزیں اس نادر اور بے عیب طور پر اس نظم میں جمع ہو گئی ہیں کہ یہی ایک نظم اپنے شاعر کا نام ہمیشہ اردو میں زندہ رکھے گی۔ دوسری نظم گریے کے

مشہور نوحے کا آزاد ترجمہ ہی جو طبا طبائی مرحوم نے کیا ہی۔ ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہی کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ مغربی تشبیہوں کی جگہ مشرقی تشبیہیں، مغربی روایاتِ شاعرانہ کی جگہ مشرقی روایاتِ شاعرانہ اس خوبی سے استعمال کی گئی ہیں کہ حیرت ہوتی ہی۔ ہر بند کا ترجمہ اس قدر صحیح اور جامع طور پر ہوا ہی کہ جہاں تک ترجمے کا تعلق ہی، اس سے بہتر ہو سکنا ناممکن تھا۔

عزیز احمد

حیدر آباد، ۲ اگست سنہ ۱۹۴۰ء

سر محمد اقبال

شمع

بزمِ جہاں میں میں بھی ہوں ای شمع دردمند — فریاد در گرہ صفتِ دانۂ سپند
دی عشق نے حرارتِ سوزِ دروں تجھے — اور گل فروشِ اشکِ شفق گوں کیا مجھے
ہو شمعِ بزمِ عیش کہ شمعِ مزار تو
ہر حال اشکِ غم سے رہی ہمکنار تو
یک بیں تری نظر صفتِ عاشقانِ راز — میری نگاہ مایۂ آشوبِ امتیاز
کعبے میں بتکدے میں ہی یکساں تری ضیا — میں امتیازِ دیر و حرم میں پھنسا ہوا
ہی شان آہ کی ترے دودِ سیاہ میں
پوشیدہ کوئی دل ہی تری جلوہ گاہ میں
جلتی ہی تو کہ برقِ تجلی سے دور ہی — بیدرد تیرے سوز کو سمجھے کہ نور ہی
تو جل رہی ہی اور تجھے کچھ خبر نہیں — بینا ہی اور سوزِ دروں پر نظر نہیں
میں جوشِ اضطراب سے سیماب وار بھی — آگاہِ اضطرابِ دلِ بے قرار بھی
تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا
احساس دے دیا مجھے اپنے گداز کا
یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہی بے قرار — خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار
یہ امتیازِ رفعت و پستی اسی سے ہی — گل میں مہک شراب میں مستی اسی سے ہی
بستان و بلبل و گل و بو ہی یہ آگہی

اصلِ کشاکشِ من و تو ہی یہ آگہی

صبحِ ازل جو حسن ہوا دل ستانِ عشق — آوازِ کُن ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق
یہ حکم تھا کہ گلشنِ کُن کی بہار دیکھ — اک آنکھ لے کے خوابِ پریشاں ہزار دیکھ
مجھ سے خبر نہ پوچھ حباب وجود کی — شامِ فراق صبح تھی میری نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا — زیبِ درختِ طور مرا آشیانہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں — غربت کے غم کدے کو وطن جانتا ہوں میں

یادِ وطن فسردگیِ بے سبب بنی
شوقِ نظر کبھی ، کبھی ذوقِ طلب بنی

ای شمع انتہائے فریبِ خیال دیکھ — مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل دیکھ
مضموں فراق کا ہوں، ثریا نشاں ہوں میں — آہنگِ طبعِ ناظمِ کون و مکاں ہوں میں
باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود — تحریر کر دیا سرِ دیوانِ ہست و بود
گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہی — بندش اگرچہ سست ہی مضموں بلند ہی
چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہی — عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہی
یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہی — طوقِ گلوئے حسنِ تماشا پسند ہی
منزل کا اشتیاق ہی گم کردہ راہ ہوں — ای شمع میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں
صیاد آپ، حلقۂ دامِ ستم بھی آپ — بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ
میں حسن ہوں کہ عشقِ سراپا گداز ہوں — کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے — تیرے صنم کدے کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہی تو خدا ہی
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہی
آ۔ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہی مدت سے دل کی بستی — آ۔ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہی
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہی

انتخاب از شمع و شاعر

پردۂ دل میں محبت کو ابھی مستور رکھ — یعنی اپنی مے کو رسوا صورتِ مینا نہ کر
خیمہ زن ہو وادئ سینا میں مانندِ کلیم — شعلۂ تحقیق کو غارت گرِ کاشانہ نہ کر
شمع کو بھی ہو ذرا معلوم انجامِ ستم — صرفِ تعمیرِ سحر خاکسترِ پروانہ نہ کر
تو اگر خود دار ہی منت کشِ ساقی نہ ہو — عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر
کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں — ہی جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر

خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر — تو عصا افتاد سے پیدا مثالِ دانہ کر
اس چمن میں پیروِ بلبل ہو یا تلمیذِ گل — یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

کیوں چمن میں بے صدا مثلِ رمِ شبنم ہے تو
لب کشا ہو جا سرودِ بربطِ عالم ہے تو

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا — دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے — راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا — ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی — قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا — مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو — خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو — قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو — دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا — جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ — تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
اب تلک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت — اے تغافل پیشہ تجھ کو یاد وہ پیماں بھی ہے
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا — ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے
دل کی کیفیت ہے پیدا پردۂ تقدیر میں — کسوتِ مینا میں مے مستور بھی عریاں بھی ہے
پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے — اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ

انتخاب از خضر راہ

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے — سرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ — جوئے شیر و تیشۂ و سنگِ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب — اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے — گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار — تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر — رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی — اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ
ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش — اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ — خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے — شکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول — غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک
نغمۂ بیداریِ جمہور ہے سامانِ عیش — قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک
آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا — آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام — دوریِ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

از طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں — جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری — یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے — ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے — حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو — لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے مشرب نابے
دل گرمے نگاہِ پاکبینے جانِ بیتابے

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سِرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

حقیقتِ منتظر

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو تو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ "اثرِ کہن"
نہ تری حکایتِ سوز میں نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سربسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

غزل

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

عذرِ پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی

ابرِ نیساں! یہ تنک بخشیِ شبنم کب تک
میرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

بادہ گردانِ عجم و عربی میری شراب
میرے ساغر سے جھجکتے ہیں نو آشام ابھی

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

میری نوائے شوق سے شورِ حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

گرچہ ہی میری جستجو، دیر و حرم کی نقش بند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

جب عشق سکھاتا ہی آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ تماشائی

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحرگاہی

نومید نہ ہو ان سے ای رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

ای طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ترے شیشے میں می باقی نہیں ہی
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہی

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہی یہ رزاقی نہیں ہی

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دم بدم

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہی عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم

انتخاب از مسجدِ قرطبہ

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات ۔ سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ ۔ جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں ۔ جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ ۔ سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار ۔ موت ہے تیری برات موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا ۔ ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر ۔ کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات

اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام ۔ جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ ۔ عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو ۔ عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا ۔ اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفیٰ ۔ عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک ۔ عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود ۔ عشق ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نورِ حیات

اے حرمِ قرطبہ عشق سے تیرا وجود ۔ عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل — خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز — تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود

وادیِ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب — لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت — کشتیِ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب
آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
پردہ اٹھا دوں اگر عالمِ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی — روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم — کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

"فرمانِ خدا"

فرشتوں سے

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

حق را بسجودے صنماں را بطوافے بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے

میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

انتخاب از ذوق و شوق

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں

چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دھل گئے

ریگ نواحِ کاظمہ، نرم ہے مثلِ پرنیاں

حسنِ ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود

دل کے لیے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں

سُرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب

کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ، طیلساں

آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر

کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی

اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے عقل غیاب و جستجو عشق حضور و اضطراب

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

جبریل اور ابلیس

جبریل

"ہمدمِ دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟"

ابلیس

"سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو!"

جبریل

"ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو؟"

ابلیس

"آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو!
اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا؟

جبریل

"کھو دیے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!"

ابلیس

"ہی مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہی تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے تھپیڑے کھا رہا ہی میں کہ تو
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

فنونِ لطیفہ

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہی لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہی
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی صدا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

شعاعِ اُمید

(۱)

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز کبھی صبح کبھی شام
مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہری ایام
نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام
پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

(۲)

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

(۳)

اک شوخ کرن شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

کہا اقبال نے پیرِ حرم سے
تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون

ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بت کدے میں کھو گیا کون

دگرگوں جہاں اُن کے زورِ عمل سے
بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے

منجّم کی تقویمِ فردا ہے باطل
گرے آسماں سے پرانے ستارے

ضمیرِ جہاں اس قدر آتشیں ہے
کہ دریا کی موجوں سے ٹوٹے ستارے

زمیں کو فراغت نہیں زلزلوں سے
نمایاں ہیں فطرت کے باریک اشارے

ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے

اختر صہبائی

سرگزشت

مرغزاروں میں چمن زاروں میں کہساروں میں
چرخ کے نور میں ڈوبے ہوئے نظاروں میں
شبِ تاریک کی بہکی ہوئی تنہائی میں
شبِ مہتاب کی مہکی ہوئی رعنائی میں
شفقِ شام کی رنگینی و سرشاری میں
صبحِ پُرکیف کے انوار کی بیداری میں
حسنِ معصوم کو ہر رنگ میں دیکھا میں نے

دیدۂ شوق سے اشکوں کی روانی نہ گئی
نہ گئی دل کی تپش شعلہ فشانی نہ گئی

تیر پر تیر برستے رہے مجھ پر برسوں
سنگ دل دور سے ہنستے رہے مجھ پر برسوں
یورشِ غم بھی سہی رنج و محن بھی دیکھے
رہِ الفت میں کئی دار و رسن بھی دیکھے
اپنے محبوب کو ہر حال میں چاہا میں نے

بزمِ امکاں میں رہا ظلمتِ باطل کا ہجوم
چھپ گئے خوف کے مارے مہ و خورشید و نجوم،

ہیبتِ اہرمنی چاروں طرف طاری تھی
مردِ حق کوش پہ یہ رات بہت بھاری تھی
حق پرستوں کے لیے خنجرِ خوں خوار کہیں
زہر کا جام کہیں، نار کہیں، دار کہیں
پرچمِ حق و صداقت کو اٹھایا پھر نے

تجلیات

یاد تیری شراب ہے ذکر ترا سرود ہے
کیفِ طرب میں موج زن میرا یہ وجود ہے

اپنی ہی دُھن میں عرش سے دور نکل گیا ہوں میں
اتنی بلندیوں پہ بھی مجھ کو غمِ صعود ہے

اس میں کہاں سرور و نور آگ ہی آگ ہی ہوس
مثلِ سموم ہر نفس آہ برنگِ دود ہے

آنکھ ہو حق شناس اگر آتا ہے تو ہی تو نظر
ورنہ تمام کائنات بت کدۂ نمود ہے

پچھلے پہر کی چاندنی نور میں ہے دُھلی ہوئی
عرشِ بریں سے پے بہ پے قدسیوں کا ورود ہے

فکرِ دل و جگر نہ کر عشق میں جان سے بھی گزر
اس میں کہیں زیاں نہیں اس میں زیاں بھی سود ہے

غرقِ سرور و نور ہوں جام و سبو سے دور ہوں
میرے لیے کھلا ہوا میکدۂ شہود ہے

اثر لکھنوی

دلھن بنی ہوئی اب کی چمن میں آئی ہے
بہار ہو کے تری انجمن میں آئی ہے

شمیمِ دوست لیے پیرہن میں آئی ہے
نسیم ہوش اڑانی چمن میں آئی ہے

ظہورِ عشق حقیقت طراز تھا ورنہ
یہ دلکشی کہیں دار و رسن میں آئی ہے

بسائی جاتی ہے اس میں قمیص یوسفؑ کی
ہوا جو مصر سے بیت الحزن میں آئی ہے

وہ بوئے خوں ہے کہ گھٹتا ہے دم معاذاللہ
بہار وادیٔ زخمِ کہن میں آئی ہے

یہ کس کی خاک ہے جو حسرتِ نشیمن میں
صبا کے دوش پہ صحنِ چمن میں آئی ہے

نسیمِ صبح کے جھونکے مہک وہ پھولوں کی
نفس نفس میں نئی روح تن میں آئی ہے

بقدرِ ذوق نہیں جوئے شیر موج افزا
ہوائے تیشہ سرِ کوہکن میں آئی ہے

گمان ہوتا ہے اُف ری کلام کی گرمی
زبانِ شعلہ اثر کے دہن میں آئی ہے

کمر ہر قدم پر لچکتی رہی
یہ بجلی سوئے دل لپکتی رہی

ادب لاکھ تھا پھر بھی اس کی طرف
نظر میری اکثر بہکتی رہی

اگر ہونٹ سی بھی لیے، کیا ہوا
نگاہوں سے الفت ٹپکتی رہی

غبارِ دلِ مضطرب چھو گیا
صبا اپنا دامن جھٹکتی رہی

نہ کھلنے پہ بھی ہے یہ دل کی کلی
گلِ تر کی صورت مہکتی رہی

دلِ زار کی آہ بھی زار تھی
اگر آئی لب پر سسکتی رہی

اثر کی سی شیوا بیانی کہاں
بہت یوں تو بلبل چہکتی رہی

صحرا سے چلے ہیں سوئے گلشن
خونیں جگراں چاک داماں

پیغام بہار دے رہی ہے
داغوں کی جھلک دلوں کی الجھن

رقصاں ہے نسیم برگِ گل پر
شبنم میں ہے گھنگروؤں کی چھن چھن

غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے
مستی میں چھوا صبا نے دامن

دل کش نہ ہو کیوں کلام اثرؔ کا
سیکھا ہے یہ اس نے میرؔ سے فن

دل عشق کی مے سے چھک رہا ہے
اک پھول ہے، جو مہک رہا ہے

آنکھیں کب کی برس چکی ہیں
کوندا اب تک لپک رہا ہے

اب آئے بہار یا نہ آئے
آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے

"متفرق اشعار"

خاکستر پروانہ میں بھی آگ دبی ہے
اے بادِ صبا دیکھ کے دامن کی ہوا دے

ہنگامۂ ہستی کی بس اتنی حقیقت ہے
اک موج تھی جو اٹھ کر پھر مل گئی دریا سے

افسانہ و افسوں ہے جلووں کی فراوانی
وہ جب نظر آتا ہے تنہا نظر آتا ہے

دل و جگر دونوں مل کے باہم مجھی کو الزام دے رہے ہیں
کہ جیسے اس کی جفا کے بدلے لٹایا ان کو میری وفا نے

بساط آرا یہاں تو ایسی کہ ہر لحظہ نئی ہو دنیا
مگر یہ ہستی یہ رنگِ ہستی کہ پا ثباتِ شرر نہیں ہو

اٹھی جو مینا سے موج صہبا دلوں میں ڈوبی سرور ہو کر
نظر میں ابھری تو نور ہو کر نظر کو لیکن خبر نہیں ہو

یہ نقش بنا ڈالا وہ نقش مٹا ڈالا
ہر آن سنورنے کو اک تازہ بہانہ ہو

محبت نے رگ رگ میں نشتر بھرے ہیں
ذرا دل دکھانا خبردار ہو کر

جب آشیاں کی یاد اسیری میں آگئی
اڑتے ہوئے ہوا میں شرر دیکھتے رہے

جھپکی ذرا جو آنکھ جوانی گزر گئی
بدلی کی چھاؤں تھی ادھر آئی ادھر گئی

کیا ہم نے چھلکتے ہوئے میخانے میں دیکھا
یہ راز ہو میخانے کا افشا نہ کریں گے

یہ اتفاق تو دیکھو بہار جب آئی
ہمارے جوشِ جنوں کا وہی زمانہ تھا

احسان بن دانش

گوالے

سامنے مسکرا رہی ہے سحر — اوس کی آفتاب پر ہے نظر
دھوپ کی چھوٹ ہے پڑا وے پر — گا رہے ہیں کمہار آوے پر
سوئے مغرب جو چنگی خانہ ہے — واں سحر درد کا فسانہ ہے
ایک جمگھٹ سا ہے گوالوں کا — گائے بکری کے دودھ والوں کا
تیز سانسوں سے ہے مجبوری — گرم ہاتھوں پہ گرد مزدوری
ان میں کچھ عورتیں بھی ہیں جن کے — بھوک سے ہیں گھٹتے ہوئے چہرے
رخ پہ بیماریِ شباب کا رنگ — دیدۂ پاک میں حجاب کا رنگ
باغ ویران شادمانی کے — پھول ٹوٹے ہوئے جوانی کے
شوخیاں دم بخود ادا خاموش — نازِ مجروح بانکپن بے ہوش
باری باری سے کر رہے ہیں ادا — ہے جو محصول زندہ رہنے کا
جب محرر کے پاس آتے ہیں — خوف کھاتے ہیں تھرتھراتے ہیں
کاش اس پائمال طبقے کو — خستہ و پر ملال طبقے کو
رہنما کوئی ایسا مل جائے — جو انھیں راہِ راست پر لائے

ان کے افلاس کا علاج کرے
علم سے مستقل مزاج کرے

جشنِ بے چارگی

ہم داغِ دل اک شامِ سیہ پوش کا منظر تھا ظلمتِ خاموش میں شہزادۂ خاور
عالم میں مچلنے ہی کو تھے رات کے گیسو انوار کے شانوں پہ تھے ظلمات کے گیسو

یہ وقت اور اک دخترِ مزدور کی رخصت
واللہ قیامت تھی قیامت تھی قیامت

نوشاہ کا جو سر پہ تھا باندھے ہوئے سہرا بھرپور جوانی میں تھا اترا ہوا چہرا
اندوہ ٹپکتا تھا بشاشت کی نظر سے مرجھائے سے رخسار تھے فاقوں کے اثر سے
کرتا بھی پرانا سا تھا پگڑی بھی پرانی مجبور تھی قسمت کے شکنجوں میں جوانی
نوشہ کے جو ساتھ آئے تھے دو چار براتی ہر اک کی جبیں سے تھی عیاں نیک صفاتی
توقیر کے، الفت کے، شرافت کے مرقعے ایثار کے، ایمان کے، غیرت کے مرقعے
ہمراہ نفیری تھی نہ باجا تھا نہ تاشا آنکھوں میں تھا بے مہریِ عالم کا تماشا

مجمع تھا یہ جب خستہ و افسردہ مکاں پر
تھا بھیس میں شادی کے وہاں عالمِ محشر

دالان تھا گونجا ہوا رونے کی صدا سے اک درد ٹپکتا تھا عرق ناک ہوا سے
اماں کی تھی بیٹی کی جدائی سے یہ حالت چیخوں میں ڈھلے جاتے تھے جذباتِ محبت
تھا باپ کا یہ حال کہ اندوہ کا مارا اٹھتا تھا تو دیوار کا لیتا تھا سہارا
وہ آپ کہیں اور تھا اور جان کہیں تھی سینے میں کوئی شے تھی جو قابو میں نہیں تھی
افلاس کے آرے جو جگر کاٹ رہے تھے ارمان سب اپنا ہی لہو چاٹ رہے تھے

لڑکی کا یہ عالم تھا کہ آپے کو سمیٹے
گڑیا سی بنی بیٹھی تھی چادر کو لپیٹے

تھی پاؤں میں پازیب نہ پیشانی پہ ٹیکا   اس خاکۂ افلاس کا ہر رنگ تھا پھیکا

انصاف زمانہ تھا کہ تقدیر کا چکر   ماں باپ کو آیا نہ تھا جوڑا بھی میسر

یوں کہنے کو دلھن تھی یہ مزدور کی دختر   اماں کا دوپٹہ تھا تو ابا کی تھی چادر

آخر نہ رہا باپ کو جذبات پہ قابو
تھرانے لگے ہونٹ ٹپکنے لگے آنسو

کہنے لگا نوشہ سے کہ اے جان پدر سن   اے وجہ سکوں، لخت جگر، نور نظر سن

گرچہ مری نظروں میں ہے تاریک خدائی   حاضر ہے مری عمر کی معصوم کمائی

کی لاکھ مگر ایک بھی کام آئی نہ تدبیر   مجبور ہوں مجبور یہ تقدیر ہے تقدیر

لیکن اسے ایمان کی دولت ہی بہت ہے   لڑکی کے لیے چادر عصمت ہی بہت ہے

اس سانولے چہرے میں تقدس کی ضیا ہے   یہ پیکر عفت ہے یہ فانوس حیا ہے

اس کے لیے چکّی بھی نئی چیز نہیں ہے   بیٹی ہے مری دختر پرویز نہیں ہے

غربت میں یہ پیدا ہوئی غربت میں پلی ہے   خودداری و تہذیب کے سانچے میں ڈھلی ہے

زنہار یہ زیور کی تمنا نہ کرے گی   ایسا نہ کرے گی کبھی ایسا نہ کرے گی

شکوہ اسے تقدیر کا کرنا نہیں آتا   ادراک کی سرحد سے گزرنا نہیں آتا

ہے صبر کی خوگر اسے فاقوں کی ہے عادت   ماں باپ سے پائی ہے وراثت میں قناعت

اس کی بھی خوشی ہوگی تمھاری جو رضا ہو
تم اس کے لیے دوسرے درجے پہ خدا ہو

پھر آکے یہ بیٹی سے کہا نرم زباں سے   بچی مری رخصت ہے تو اب باپ سے ماں سے

امید ہے ہر بات کا احساس رہے گا   ماں باپ کی عزت کا تجھے پاس رہے گا

اے جان پدر دیکھ وفادار ہی رہنا   آئے جو قیامت بھی تو ہنس کھیل کے سہنا

دل توڑ نہ دینا کہ خدا ساتھ ہے بیٹی

لاج اس مری ڈاڑھی کی تمہارے ہاتھ ہے بیٹی

آیا جو نظر مجھ کو یہ جاں کاہ نظارہ   احساس نہ آنکھوں کو رہا ضبط کا یارا
تپنے لگی ہر سانس مری سوزِ نہاں سے   اتنا ہے مجھے یاد کہ نکلا یہ زباں سے
اے خالقِ کونین یہ تو نے بھی سنا ہے   دنیا کا گماں ہے کہ غریبوں کا خدا ہے
تو جن کا خدا ان کا ہو گردش میں ستارا   کیا تیرے کرم کو یہ ستم بھی ہے گوارا
کس طرح نہ ہو دل کو بھلا رنج و محن دیکھ   مزدور کے اس زندہ جنازے کا کفن دیکھ

احساس کبھی دل سے جدا ہو نہیں سکتا
انسان ہے انسان، خدا ہو نہیں سکتا

طوفانی نغمہ

زمانہ ہو گیا گنگا میں اک آئی تھی طغیانی   جلو میں جس کے دامن تھام کر چلتی تھی ویرانی
تھا جل تھل ایک کوسوں تک مسافر تھے نہ راہیں تھیں   یہ عالم تھا ہیولے شام کے لب پر بھی آہیں تھیں
جو ریلا ہٹ پڑا کرتا کہاں کروٹ بدلتا تھا   بیابانوں کی پیاسی ریت کا دم سا نکلتا تھا
تھی دہشت آفریں پھنکارتی موجوں کی بیباکی   سرِ ساحل سراسیمہ تھی پیراکوں کی پیراکی
درختوں کے قدم جمتے نہ تھے سیلاب کے آگے   فلک کی گردشیں بے کار تھیں گرداب کے آگے
عجب بپھری ہوئی موجوں کا نقشہ تھا روانی میں   کہ جیسے تیرتی ہوں جل پریاں قالین پانی میں
ہوائیں تیز کر دیتی تھیں جب تیور دریڑوں کے   کنارا دھم سے گر کر پانو چھوتا تھا تھپیڑوں کے
ہر ایک ریلے میں خونی موت کے قدموں کی آہٹ تھی   فضائے بحر میں سیلِ بلا کی سنسناہٹ تھی
جدھر پانی کا رخ ہوتا تھا ساحل گرتا جاتا تھا   کسانوں کی عرق ریزی پہ پانی پھرتا جاتا تھا
بہا کر بستیاں دھارے نے کی تھی رہ گزر پیدا   جو ٹکرائی تھیں دو موجیں تو ہوتے تھے بھنور پیدا

یقیں ہوتا تھا اکثر جوشِ طوفاں کے قرینے سے
کہ اب ٹل جائے گا جھک کر فلک گنگا کے سینے سے

نہ بیڑوں کا پتا تھا اور نہ کوسوں گھاٹ ملتا تھا
جہاں تک کام کرتی تھیں نگاہیں پاٹ ملتا تھا

مویشی نیم جاں تھے ہوش پرّاں تھے درندوں کے
بہے جاتے تھے بچے آشیانوں سے پرندوں کے

کہیں بہتا نظر آتا تھا ساماں خانہ داری کا
کہیں غرقاب ہوتا تھا سفینہ کشت کاری کا

گھلا تھا ہر طرف رنگِ شفق دریا کے پانی میں
کہ موجیں سرد انگارے اگلتی تھیں روانی میں

نہ کشتی کا نہ ساحل پر پتا تھا ناخداؤں کا
تسلط تھا فقط طوفاں کے خونی دیوتاؤں کا

بچارے بے گھرے ہالی موالی روتے جاتے تھے
غریبوں کے مکاں موجوں کے لقمے ہوتے جاتے تھے

ہرن دلدل میں پھنس کر رہ گئے تھے خستہ جانی سے
نکل آئی تھیں اندھی مچھلیاں گھبرا کے پانی سے

فلک سے ہانپ کر بیمار سورج گرنے والا تھا
زمیں کی نعش پر کالا کفن قدرت نے ڈالا تھا

اسی نازک سمے میں جب تھے دونوں وقت ملنے کو
زمیں پر غش تھا طاری چرخ پر تھے پھول کھلنے کو

بہا آتا تھا اک چھپر پہ اک اندھا پجاری بھی
جسے قسمت سے حاصل تھا کمالِ نغمہ باری بھی

بھجن گاتا ہوا آتا تھا اکتارے کے تانوں پر
ہوا میں اس کے تانیں جا رہی تھیں آسمانوں پر

بدن پر جوگیا بانا لٹیں شانوں پہ آوارہ
ہر اک موجِ نفس معراجِ روحانی کا ہرکارہ

نوا میں سوز بھی بشرے پہ نورِ حق پرستی بھی
تنک بھی، خوش بھی جذبِ خودداری بھی مستی بھی

نہ بے صبری نہ بے ہوشی نہ بے چینی نہ بے تابی
وہی مضراب کی ضربت وہی چہرے کی شادابی

ترانے تیرتے تھے جب بھی گنگا کے دھارے پر
تو اک گاتی ہوئی خشکی پہنچتی تھی کنارے پر

بھجن حل کر کے گردابوں میں گنگا بہتی جاتی تھی
جو لے چھیڑتی تھی موجوں کے گریباں سیتی جاتی تھی

ہوائیں راگ کے پاکیزہ لہروں میں نہاتی تھیں
اندھیری رات کے بچپن کی گھڑیاں گنگناتی تھیں

اندھیرا جب ذرا گہرا ہوا اک دم فضا بدلی
ہوا کم ہانپتا طوفان، دیوانی ہوا بدلی

فسونِ کم روی فطرت نے پھونکا تیز دھارے پر
وہ چھپّر رفتہ رفتہ آ لگا آخر کنارے پر

نکالا کھینچ کر دیہاتیوں نے اس پجاری کو — کہ وہ پہلا فریضہ جانتے ہیں غم گساری کو
حریمِ دل میں غیرت، شرم ہے آنکھوں کے پردوں میں — ابھی تک بھی یہاں مردانگی باقی ہے مردوں میں

گئے گزرے بھی اچھے ہیں یہ شہری منچلا ہوں سے
برس پڑتی ہیں اب بھی بجلیاں ان کی نگاہوں سے

کہا میں نے پجاری سے یہ آخر ماجرا کیا تھا — کہ یہ کف در دہاں طوفان اور تو نغمہ پیرا تھا

جواب اس نے دیا مجھ کو کہ سن اے شاعرِ دانا
فنا کو تو نے کیا سمجھا بقا کو تو نے کیا جانا؟

قضا آتی ہے جب دیتی نہیں اک پل بھی جینے کو — ڈبو دیتی ہے ظالم رہ گزاروں میں سفینے کو
تو پھر ہم موت کو اک لمحہ کیوں دیں زندگانی کا — کریں کیوں فکر کر کے رنگ پھیکا شادمانی کا

جو موت آتی ہے آئے مرد کو مرنے کا غم کیسا؟
عمارت میں خوشی کی دفترِ رنج و الم کیسا؟

اختر شیرانی

تأثراتِ نغمہ

نظر کے سامنے رقصاں ہیں رنگیں وادیاں گویا!
شراب و شعر میں ڈوبی ہوئی ساری فضائیں ہیں
اُفق پر موج زن آوارہ خوابوں کی گھٹائیں ہیں
فضا میں بس رہی ہیں نور کی آبادیاں گویا!
خلا میں پرفشاں ہیں خواب کی شہزادیاں گویا
بہار و کیف سے لبریز مستانہ ہوائیں ہیں
اور ان میں منتشر غمگین روحوں کی صدائیں ہیں
مہیا ہیں سکون و ہوش کی بربادیاں گویا!

وہ دنیا ہے جہاں جنت کے نظارے برستے ہیں
شفق کی سطح پر آباد خوابوں کے جزیرے ہیں
ستاروں کے سمندر ماہتابوں کے جزیرے ہیں
بہاریں منظروں میں پھول اور تارے برستے ہیں
فضا ہے مست موجِ نکہتِ بادِ بہاری سے
اور اس پر تیرتا پھرتا ہوں میں بے اختیاری سے

وادیٔ گنگا میں ایک رات

کرتے ہیں مسافر کو محبّت سے اشارے
ای وادیٔ گنگا ترے شاداب نظارے
یہ بکھرے ہوئے پھول یہ بکھرے ہوئے تارے
خوش بو سے مہکتے ہوئے دریا کے کنارے

یہ چاندنی رات اور یہ پُرخواب فضائیں
اک موجِ طرب کی طرح بے تاب فضائیں
سبزے کا ہجوم اور یہ شاداب فضائیں
مہکے ہوئے نظارے ہیں بہکے ہوئے تارے

یہ تارے ہیں یا نور کے مے خانے ہیں آباد
معصوم حسیں حوروں کے کاشانے ہیں آباد
مستانہ ہواؤں پر پری خانے ہیں آباد
یا دامنِ افلاک میں بے تاب شرارے

مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
الماس کی صورت ہے کہ مندر میں دھری ہے
مرمر کی صراحی مئے سیمیں سے بھری ہے
اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے سہارے

نیند در میں ہیں کھوئی ہوئی بیدار ہوائیں
گل زار ہیں گل ریز گہر بار ہوائیں
یا نور میں ڈوبی ہوئی سرشار ہوائیں

یا بال فشاں مستیٔ نکہت کے نظارے

صحرا ہیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں

دامن میں لیے چاند ستاروں کے شبستاں

فردوس کی پُرکیف بہاروں کے شبستاں

شاعر کو تمنا ہے یہیں رات گزارے

جوگن

دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے — موسیقیٔ حزیں کے دریا بہا رہی ہے
غمگین نوائیوں سے بیخود بنا رہی ہے — دنیا کے ہر اثر کو دل سے مٹا رہی ہے
سوئی ہوئی فضا کا شانہ ہلا رہی ہے — ہر جنبشِ زباں سے مُردے جِلا رہی ہے
بیدار کر رہی ہے مدہوش گھاٹیوں کو — خوابیدہ ساحلوں کی نیندیں اُڑا رہی ہے
ہر لرزشِ صبا میں طوفاں امڈ رہے ہیں — پنچم میں کیا رسیلی تانیں اڑا رہی ہے
دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

اٹکھیلیوں کا سن ہے ہنس بولنے کے دن ہیں — لیکن نہ جانے کیوں وہ آنسو بہا رہی ہے
آئینہ رنگ سینہ کچھ کھل رہا ہے جس میں — دوشیزگی کی گنگا طوفاں اُٹھا رہی ہے
اک گیروا نہ ساڑی میں ہے بدن چھپائے — یا ہلکی ہلکی بدلی سورج پہ چھا رہی ہے
اک بجریا سیں پہ لہرا رہی ہے ناگن — یا اس کی زلفِ مشکیں سینے پہ آ رہی ہے
ہے اک ستار اس کی آغوشِ نازنیں میں — وہ نازک انگلیوں سے جس کو بجا رہی ہے
دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں جا رہی ہے

سبزے پہ چاندنی کے بادل برس رہے ہیں — یا کوئی حورِ جنت آنسو بہا رہی ہے
ہے موج زن ہوا میں اک آبشارِ سیمیں — یا ملکۂ پرستاں موتی لٹا رہی ہے
اک گردِ مرمریں ہے چھائی ہوئی افق پر — جس کو ہوائے صحرا کوسوں اڑا رہی ہے
اک موجِ گوہریں سی ہر پھول پر ہے چھائی — نکہت کی بوئے رنگیں جس میں سما رہی ہے
یا دن کے مقبرے پر دوشیزۂ شب آکر — کلہائے نور کی اک چادر چڑھا رہی ہے
دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

جنگل کے جانور کچھ بیٹھے ہیں اس کے آگے — رو رو کے جن کو اپنی بپتا سنا رہی ہے
خونخوار شیر بھی ہیں وحشی غزال بھی ہیں — لیکن وہ سب کے دل پر سکہ جما رہی ہے
کچھ سانپ جھومتے ہیں لہرا کے مست ہو کر — اک موجِ وجد آور ان کو نچا رہی ہے
طاؤس ناچتا ہے یوں بے قرار ہو کر — گویا ہر ایک پر میں بجلی سما رہی ہے
غمگین نوائیوں سے ایسا سماں بندھا ہے — رو رو کے جیسے فطرت طوفاں اٹھا رہی ہے
دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

یہ موہنی بنی ہے کس کی لگن میں جوگن — یہ نیر درد کس کے غم میں بہا رہی ہے
ہاں شاید اس کی ننھی معصوم آتما میں — ہر کی پریم اگنی لو سے لگا رہی ہے
ہر بن میں ہر نگر میں ہر گھر میں ہر ڈگر میں — پھر پھر کے اپنے دل کی بپتا مٹا رہی ہے
یا ہر کی جستجو میں پیتم کی آرزو میں — کاشی سے آرہی ہے متھرا کو جا رہی ہے
یا جگ کی آفتوں سے تنگ آ کے بن میں جا کے — پرماتما کو اپنا دکھڑا سنا رہی ہے
دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

اب نغمے سو گئے ہیں یا جاگ بھی تھک چلا ہی — محشر اٹھا چکی ہی فتنے جگا رہی ہی
ایسی دبی صدا ہی گویا عروسِ نغمہ — منہ پھیر کر ہوا سے دامن چھڑا رہی ہی
یا کچھ غنودگی کے عالم میں مست کویل — دھرتی کے گوپیوں کا دل گدگدا رہی ہی
سنکھ کھل گیا ہی جیسے بادل کوئی برس کر — یا شمع جل جلا کر اب جھلملا رہی ہی
لو وہ ستار کو بھی نیند آگئی بغل میں — لو وہ ستار اٹھا کر جنگل سے جا رہی ہی
دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہی

میں تو مگر کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں — جیسے وہ ظالم اب تک ویسے ہی گا رہی ہی
اب تک فضا پہ ہی وہ کھویا ہوا سا عالم — اب تک اُفق پہ یکسر مستی سی چھا رہی ہی
اب تک اٹھا رہا ہی ساز اس کا ابرِ نغمہ — اب تک زبان اس کی بجلی گرا رہی ہی
پھولوں سے اب تک اس کے نغمے ٹپک رہے ہیں — پتوں سے اب تک اس کی آواز آ رہی ہی
اب تک میں سر جھکائے حیرت زدہ کھڑا ہوں — اب تک وہی تجلّی آنکھوں پہ چھا رہی ہی
دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہی

علی اختر

شاعر فلسفی سے

تری نگاہ ہے وابستۂ فریبِ نمود — بہ ایں رعونتِ پندار و نازِ بینائی
جگا سکی نہ تجھے اے رہینِ خوابِ گراں — بہار کی چمن افروز نغمہ پیرائی
مٹا سکی نہ تری روح کی جبیں سے شکن — فروغِ ماہ میں لیلائے شب کی رعنائی
گرا سکی نہ کبھی بجلیاں ترے دل پر — سوادِ شب میں عروسِ سحر کی انگڑائی
تجھے نہ کیف کے رازوں سے کر سکا آگاہ — تبسمِ لبِ شیریں، جمالِ برنائی
یہاں کہ ذرۂ خاکی ہے آفتاب فروش — یہاں کہ ریزۂ مینا ہے جامِ صہبائی
یہاں کہ سینۂ خس میں رواں ہے روحِ بہار — یہاں کہ رقصِ شرر میں ہے نورِ سینائی
تجھے خبر بھی ہے نا واقفِ سرشتِ حیات — کہ رازِ بے خبری ہے کمالِ دانائی

ہوا نہ صرفِ یقیں رنگِ احتمال ترا
تغیّرات کی زد میں رہا کمال ترا

اگرچہ میں بھی ہوں گم کردۂ طلسمِ حیات — مجھے ہے کھیل مگر اس جہاں کی بوالعجبی
یہ جانتا ہوں کہ ہے اک ادائے پرتوِ رنگ — تلاطمِ سحری ہو کہ خوابِ نیم شبی
ملا ہے فیض سے فطرت کے وہ دلِ آگاہ — کہ موجِ بادۂ عرفاں ہے میری تشنہ لبی
غلط نہیں ہے اگر ہو مذاقِ کیف و جمال — خسِ ذلیل کو بھی دعوئے چمن نسبی
کشش ہے کس کی کہ اتراتا ہے ماہیِ آب — ہر ایک ذرّہ ہے آسودۂ فنا طلبی

ملے جو ساغرِ زہر آب مسکراتا ہوں ۔ کہ اس میں پاتا ہوں میں روحِ آتشِ عنبی
کسی کا عکس ہے نبضِ حیات کی جنبش ۔ یہ کائنات ہے ہم رنگِ شیشۂ حلبی
مجھے تلاش ہے جس کی وہ مل چکا ہے مجھے ۔ یہ ایں جسارتِ رندی و شانِ بے ادبی

ہجومِ دہر میں سرگرمِ اہتمام ہوں میں ۔ فنا پذیر ہے تو طالبِ دوام ہوں میں

غزل

فریبِ جلوہ کہاں تک بروئے کار رہے ۔ نقاب اٹھاؤ کہ کچھ دن ذرا بہار رہے
خرابِ شوق رہے وقفِ انتظار رہے ۔ اب اور کیا ترے وعدوں کا اعتبار رہے
میں رازِ عشق کو رسوا کروں معاذ اللہ ۔ یہ بات اور ہے دل پر نہ اختیار رہے
بھر اہلِ شوق ہیں سرگرمِ اہتمامِ نظر ۔ وہ رقصِ برقِ تجلی پھر ایک بار رہے
سکونِ عشرتِ کونین اس کا حصہ ہے ۔ وہ دل جو تیرے تصور میں بے قرار رہے
چمن میں رکھ تو رہا ہوں بنا نشیمن کی ۔ خدا کرے کہ زمانہ بھی سازگار رہے
جنوں کا رُخ ہے حریمِ حیات کی جانب ۔ الٰہی پردۂ اوہام اعتبار رہے

جہاں میں قدرِ سکوں اس سے پوچھیے اختر
وہ غم نصیب جو اک عمر بے قرار رہے

اختر انصاری

آرزو

دل کو برباد کیے جاتی ہی   غم بدستور دیے جاتی ہی
مرچکیں ساری امیدیں اختر   آرزو ہی کہ جیے جاتی ہی

ضبطِ اشک

ان آنسوؤں کو ٹپکنے نہ دیا تھا میں نے   کہ خاک میں نہ ملیں میری آنکھ کے تارے
میں ان کو ضبط نہ کرتا اگر خبر ہوتی   پہنچ کے قلب میں بن جائیں گے یہ انگارے

شعر گوئی

خوں بھرے جام انڈیلتا ہوں میں   ٹیس اور درد جھیلتا ہوں میں
تم سمجھتے ہو شعر کہتا ہوں   اپنے زخموں سے کھیلتا ہوں میں

محبّت

محبّت ہی ایک خوش نما شوخ کانٹا   جو چبھتا ہی آنکھوں کے پردوں میں پہلے
وہ پھر بیٹھ جاتا ہی دل کی رگوں میں   خلش اول اور بعد میں درد بن کے

افسردہ چاندنی

موت کی سی پُر سکوں ویرانیاں عرش سے تا فرش ہیں چھائی ہوئی
چاندنی پھیلی ہوئی ہے ہر طرف رات کی میّت ہے کفنائی ہوئی

مُسکراہٹ اور ہنسی

مُسکرائی وہ حبیب تو میں سمجھا کسی بربط سے نغمہ پھوٹ پڑا
ہنس پڑی وہ تو یہ ہوا معلوم دستِ ساقی سے جام چھوٹ پڑا

جفائے آرزو

وہ کانٹا کہ تھی جس سے چاہت مراد مرے دل میں پائی جگہ رہ گیا
کیا دل کو ویراں لہو چوس کر مگر خود بھی کانٹا چبھا رہ گیا

اظہارِ محبّت

مَیں نے حسرت سے کہا تم سے محبّت ہے مجھے
تم نے شرماتے ہوئے مجھ کو جواب اس کا دیا
آہ لیکن دل ناشاد رہ غارت ہو جائے
اس قدر زور سے دھڑکا کہ مَیں کچھ سن نہ سکا

فطرت

یہاں سے دور جنگل میں رہا کرتی ہے ایک دیوی　　وہ غم دیدہ دلوں کو غم کے بدلے عیش دیتی ہے
میں جب روتا ہوا جاتا ہوں اس کی بزم عشرت میں　　تو بڑھ کر ریشمی آنچل سے آنسو پونچھ لیتی ہے

مبتلائے محبّت

تو جو راتوں کو اٹھ کے روتا ہے　　آہ کیوں اپنی جان کھوتا ہے
ہم تمھیں چاہتے ہیں تم ہم کو　　بس فسانوں میں ہی یہ ہوتا ہے

برسات

مہین پھوار کے قطرے ہیں برف کے ریزے　　بھری ہوئی ہیں ہواؤں میں خنکیاں یکسر
فضا ہے بھیگی ہوئی اور جل رہا ہوں میں　　خدا کی مار سلگتی ہوئی جوانی پر

رازِ دل

تکلیف یہ ہر وقت کی ہوتی نہیں برداشت　　یہ بار الم آہ اٹھایا نہیں جاتا
وہ راز کہ اغیار سے کہہ بھی نہیں سکتے　　سینے میں بھی اللہ چھپایا نہیں جاتا

آرزو لکھنوی

غم دے تو دل بھی شمع کا پروردگار دے — جو ساری عمر ایک طرح پہ گزار دے
جس دل میں ہو نہ کیفِ محبت وہ دل نہیں — ساغر وہ ہے جو بوئے مئے خوش گوار دے
اک انتظارِ وعدۂ دیدار کے لیے — مہلت کچھ اور زندگیٔ مستعار دے
لازم ہے عہد نامۂ الفت پہ مہر بھی — لینا ہو دل تو داغ بھی اے گل عذار دے
بر وقت یہ بھی ہو نہ سکا شوقِ دید سے — جاتے ہوئے حواس کو بڑھ کر پکار دے
بے اختیار ہو کے رہا دل کو کیا رہا — ایسی فضول شے بھی نہ پروردگار دے
بے کیف زندگی کا نتیجہ کوئی نہیں — دے اضطراب بھی جو خدا انتظار دے
ہوتا ہے خامشی سے بھی اظہارِ حالِ دل — خالق زبان دے کہ نہ دے اختیار دے
انساں کے ڈیل بھر میں جو کچھ ہے زبان ہے — یہ ایک پانسہ پھینک کے جو چاہے ہار دے

مارا پڑے گا جوششِ جوانی میں آرزو
غفلت میں یہ خراب زمانہ گزار دے

رونے پہ میرے ہنستے کیا ہو جیسے سمجھے ہو ویسا نہ جانو
دل کس سے لگایا ہے تم نے تم درد کسی کا کیا جانو
کہہ سکتے نہیں یہ بھی سودائی ہے تو [illegible] اٹھنے سے پہلے کیا دیکھا
[illegible] کیا [illegible] کیسا اس کو بھی بس اک پردا جانو
رونے پہ کسی کے کوئی ہنستے [illegible] روئے
[illegible] جس کی وہ جانے ہم کیا سمجھیں تم کیا جانو

ہر چند سمجھ کیا سکتے ہو چپ رہ کے مری خاموشی کو
بت بن چکے اب انساں ہو اتنا تو کہو جتنا جانو

کہنے سے نہ کہنا ہی اچھا نادان سے پروا ہی اچھا
ہر طرح ہے اچھا ہی اچھا تم حال نہ جانو یا جانو

مایوس وہ دل ہے پہلو سے آخر کہو کس کا ہو کے رہے
جس کو نہ کہیں اچھا سمجھوں جس کو نہ تمہیں اپنا جانو

میدانِ تصوّر محکم ہے آزاد خیالی کیا کم ہے
بے قید جنوں کا عالم ہے زنداں بھی ہو تو صحرا جانو

سیلابِ نگاہِ حسرت زا جب چاہے ڈبو دے یہ دُنیا
سمجھو نہ اسے سوکھا چشمہ بہتا ہوا اک دریا جانو

ای آرزو ان سے تم نہ کھنچو بڑھ جائے گی وحشت دیکھو تو
اس سلسلۂ بے ربطی کو زنجیرِ جنوں افزا جانو

پانی میں آگ دھیان سے تیرے بھڑک گئی
آنسو میں کوندتی ہوئی بجلی جھلک گئی

کب تک یہ چھوٹی آس کہ اب آئے وہ اب آئے
پلکیں جھپکیں، پپوٹے تنے، آنکھ تھک گئی

ندی بھی آنسوؤں نے بہا دی تو کیا ہوا
کھولن جو تھی لہو میں نہ وہ آج تک گئی

دونوں کو ایک کرتی ہے بڑھ کر لگی کی آگ
اٹھی یہاں سے آنچ وہاں تک لپک گئی

یہ دن دہاڑے سامنے کون آ گیا کہ دھوپ
پڑتے ہی چھاؤں کانپ کے پیچھے سرک گئی

کھلنا کہیں چھپا بھی ہے چاہت کے پھول کا
لی گھر میں سانس اور گلی تک مہک گئی

آنسو رکے تھے آنکھ میں دھڑکن کا ہو بُرا
ایسی تکان دی کہ پیالی چھلک گئی

میری سنک بھی بڑھتی ہے ان کی ہنسی کے ساتھ
چٹکی کلی کہ پاؤں کی بیڑی کھڑک گئی

جس نے اڑا دی راتوں کی نیند اور دن کا چین
جی سے نہ پھر بھی آرزو اس کی للک گئی

جو سامنے اب تک آئے نہیں کیوں دھیان میں آئے جاتے ہیں
آنکھوں سے ابھی تک اوجھل ہیں اور جی میں سمائے جاتے ہیں
ان الٹی سیدھی باتوں سے ہم تو گھبرائے جاتے ہیں
ڈھارس بھی دیے جاتے ہیں وہ آنسو بھی بہائے جاتے ہیں
جب ان کے جھوٹے اپنے بھی سن لینے کو تیار رہیں ہم!
چک جانے کا جھگڑا آپس میں کیوں لوگ بلائے جاتے ہیں
ہٹ اپنی اپنی بات کی ہے دھیان اپنی اپنی آن کا ہے
ہم ہیں کہ تلے ہیں مٹنے پر وہ ہیں کہ مٹائے جاتے ہیں
جینا ہے تو دکھ بھی ہیں سکھ بھی رونا بھی ہے ہنسنا بھی ہے
بین ایک ہی ہوتی ہے جس پر سب راگ بجائے جاتے ہیں
اب آرزو اس پھلواری میں بسنے کا سہارا کوئی نہیں
دو سوکھے تنکے لا کے رکھو تو وہ بھی جلائے جاتے ہیں

متفرقات

قید کی حد میں بڑھا لی ہم نے آزادی کی حد
یوں دیا جھٹکا کہ حلقے کھنچ گئے زنجیر کے

اے سانس نہ آ کہ دل میں ہے زخم — ٹیس اٹھتی ہے جب ہوا لگی ہے

اب ایسے نہ تھے ہم کہ چھیڑو تو رو دیں — بہا ہو گا کوئی کلیجے کا چھالا

کالی گھٹا میں کوندا لپکا روکے جو کوئل کوک گئی — جتنی گہری سانس کھنچی تھی اتنی لمبی ہوک گئی

جمع ہوئے ہیں کچھ حسیں گرد مرے مزار کے — پھول کہاں سے کھل گئے دن تو نہ تھے بہار کے

ہاتھ سے کس نے ساغر ٹپکا موسم کی بے کیفی پر — اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

اشکوں سے راز کھلتا کیا خونِ آرزو کا — آنکھوں تک آتے آتے رنگ اڑ گیا لہو کا

غم دیا کہ مسرت دی ہے — سب میں ایک طرح کی لذت دی ہے

آزاد انصاری

نرالی آن پیدا کر، انوکھی شان پیدا کر   جگر زخمی، دل آشفتہ، نظر حیران پیدا کر
محبت تجھ کو آداب محبت خود سکھا دے گی   ذرا آہستہ آہستہ اُدھر رجحان پیدا کر
جو الفت ہو تو الفت کی نظر سے مطمئن فرما   جو دعویٰ ہو تو دعوے پر کوئی برہان پیدا کر
اگر آزاد سا درویش آنکھوں میں نہیں جچتا
تو جا اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

~~~~~

آؤ پھر موقع ہے کچھ اسرار کی باتیں کریں   صورتِ منصور ہمکیں دار کی باتیں کریں

~~~~~

آؤ پھر عہدِ وصالِ یار کی باتیں کریں   داستانِ لطف چھیڑیں پیار کی باتیں کریں
آؤ پھر اس جلوۂ گل بار کی باتیں کریں   پھول برسائیں گل و گلزار کی باتیں کریں

~~~~~

آؤ پھر اس ساقیٔ دلبر کا چھیڑیں تذکرہ   آؤ پھر اس شاہدِ مے خوار کی باتیں کریں
آؤ پھر اس ہمدم کا فر کا چھیڑیں تذکرہ   آؤ پھر اس یارِ نادیں دار کی باتیں کریں

~~~~~

آؤ پھر ارمانِ محرابِ عبادت بھول جائیں   آؤ پھر اس ابروئے خم دار کی باتیں کریں
آؤ پھر ایقانِ اعجاز و کرامت بھول جائیں   آؤ پھر اس لعلِ افسوں کار کی باتیں کریں

~~~~~

آؤ پھر اس دل شکن انکار کا قصہ سنائیں   آؤ پھر اس جاں فزا اقرار کی باتیں کریں
~~~~~

آؤ پھر اس بامزہ تکرار کا قصہ سنائیں — آؤ پھر اس صلح زا پیکار کی باتیں کریں
حضرتِ آزاد سب نامحرمِ اسرار ہیں — کس سے بے خوفِ فسادِ اسرار کی باتیں کریں

بیانِ رازِ دل کی خواہشیں اور وہ بھی ممبر پر — خبر بھی ہے یہ باتیں دار پر کہنے کی باتیں ہیں

کس کی لگاوٹ کس کی لاگ — بھاگ بلائے عشق سے بھاگ
زلفوں والو! یہ اندھیر — ڈھیرے ڈھیرے کالے ناگ

ضرورت ہے کہ میرا قصۂ غم ہر زباں پر ہو — نصیحت کی نصیحت ہے کہانی کی کہانی ہے

وہی تم کہ خواہشِ جان و دل، وہی دل کہ کاہشِ جاں گسل
وہی تم ہو اور وہی جیت ہے، وہی ہم ہیں اور وہی ہار ہے

شرحِ دردِ دل سے شرحِ درد ہی مطلب نہیں
خود تڑپنا بھی ہے دُنیا بھر کو تڑپانا بھی ہے

نہ دُنیا کا مجھے رکھا نہ دیں کا — گلہ ہے تیرے لطفِ بے کراں سے
اسے او صبر و سکوں لے جانے والے — بتا! صبر و سکوں لاؤں کہاں سے

افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی — خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

آ مگر اس قدر قریب نہ آ　　کہ تماشا محال ہو جائے

جو بتوں کو خدا سمجھتے ہیں　　وہ نہیں جانتے خدا کیا ہے

عشق میں اپنا جی نہ تیاگ　　عشق نہیں ہے آگ ہے آگ
کس کی لگاوٹ کس کی لاگ　　بھاگ بلائے حسن بھاگ

نثار اس شوخ کے جس نے شب وصل　　خود آئین ہم آغوشی سکھایا

اصغر حسین اصغر گونڈوی

انتخابِ غزلیات

خوب دن تھے ابتدائے عشق کے — اب دماغِ نالہ و شیون کہاں
سارے عالم میں کیا تجھ کو تلاش — تو ہی بتلا ہو رگِ گردن کہاں

~~~

فتنہ سامانیوں کی خو نہ کرے — مختصر یہ کہ آرزو نہ کرے
پہلے ہستی کی ہو تلاش ضرور — پھر جو گم ہو تو جستجو نہ کرے
ماورائے سخن بھی ہو کچھ بات — بات یہ ہو کہ گفتگو نہ کرے

~~~

رُخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی
نقاب اس نے الٹ کر یہ حقیقت ہم پہ عریاں کی
یہیں پر ختم ہو جاتی ہیں بحثیں کفر و ایماں کی
حقیقت کھول دیتا ہیں جنوں کے رازِ پنہاں کی
قسم دے دی ہو لیکن قیس نے چاکِ گریباں کی
اسیرانِ بلا کی حسرتوں کو آہ کیا کہیے
تڑپ کے ساتھ اونچی ہو گئی دیوارِ زنداں کی

~~~
~~~

اک عالمِ حیرت ہے فنا ہے نہ بقا ہے — حیرت بھی یہ حیرت ہے کہ کیا جانیے کیا ہے
سنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی — کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے

پہلی نظر بھی آپ کی اُف کس بلا کی تھی — ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پر لیے ہوئے
اصغر حریمِ عشق میں ہستی ہی جرم ہے — رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لیے ہوئے

ترے جلووں کے آگے ہمتِ شرحِ بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی
مٹی جاتی ہے بلبل جلوۂ گل ہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی
کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل پر
بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھ دی
الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

بے محابا ہو اگر حسن تو وہ بات کہاں — چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی
خرمنِ گل سے لپٹ کر وہیں مرجانا تھا — اب کرے کیوں گلۂ تنگیٔ داماں کوئی
کیا مرے حال پہ سچ مچ انہیں غم تھا قاصد — تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی

نہ کچھ فنا کی خبر ہے نہ ہے بقا معلوم — بس ایک بے خبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم

ہم ایک بار جلوۂ جانانہ دیکھتے — پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے
اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہو رقص میں — تم چیر کر تو سینۂ پروانہ دیکھتے

ہزار جامہ دری صد ہزار بخیہ گری — یہاں ہے خیر سے سب کچھ نثار بےخبری
مزاجِ عشق بہت معتدل ہے ان روزوں — جگر میں آگ دہکتی ہے آنکھ میں ہے تری
جو مجھ پہ گزری ہے شب بھر وہ نہ پوچھئے ہمدم — چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے — پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے
لو شمعِ حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے — فانوس کی گردش میں کیا کیا نظر آتا ہے

اس طرح چھیڑیے افسانۂ ہجراں کوئی — آج ثابت نہ نظر آئے گریباں کوئی

کثرتِ مظاہر ہے دفترِ فنا آموز — نیند آئی جاتی ہے حسن کے فسانے سے
ایک ایک تنکے پر سوختگی طاری — برق بھی لرزتی ہے میرے آشیانے سے

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں — کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
چمن میں کس مزے سے چھیڑتی ہے غنچہ و گل کو — مگر موجِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی
اڑا دیتا ہوں اب بھی تار تارِ ہست و بود اصغر — لباسِ زہد و تمکیں پر بھی عریانی نہیں جاتی

غزل

ستاروں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی — تمام شعبدہ ہائے طلسمِ بے سببی

گزر گئی ترے مستوں پہ یہ بھی تیرہ شبی — نہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی
یہ زندگی ہی یہی اصلِ علم و حکمت ہے — جمالِ دوست و شبِ ماہ و بادہ عنبی
فروغِ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے — ادا و رسم ہلالی و طمطرِّ بولہبی
ہجومِ غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا — کہاں ہے آج تو اے آفتابِ نیم شبی
سرشت عشق طلب اور حسن بے پایاں — حصولِ تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی
وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اڑائی ہیں — جہاں سے تو نے لیے خندہ ہائے زیر لبی
کشش نہ جامِ نگاریں کی پوچھ اے ساقی! — چھلک رہا ہے مرا آب و رنگِ تشنہ لبی

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا
میں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی — جلووں کے اژدحام نے حیراں بنا دیا
یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی — یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا
کچھ شورشوں کی نذر ہوا خونِ عاشقاں — کچھ جم کے رہ گیا اسے حرماں بنا دیا
اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی — کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا
کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی — جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا
کیا کیا قیود دہر میں ہیں اہلِ ہوش کے — ایسی فضائے صاف کو زنداں بنا دیا
اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موج زن — آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا
مجبوریٔ حیات میں رازِ حیات ہے — زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا
وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے — جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا
ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر — تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا
بلبل بہ آہ و نالہ و گل مست رنگ و بو — مجھ کو شہیدِ رسمِ گلستاں بنا دیا
کہتے ہیں اک فریبِ مسلسل ہے زندگی — اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنا دیا

غزل

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

نظر وہ ہی جو اس کون و مکاں کے پار ہو جائے
مگر جب روئے تاباں پر پڑے بیکار ہو جائے

تبسّم کی ادا سے زندگی بیدار ہو جائے
نظر سے چھیڑ دے رگ رگ مری ہشیار ہو جائے

تجلّی چہرۂ زیبا کی ہو کچھ جامِ رنگیں کی
زمیں سے آسماں تک عالمِ انوار ہو جائے

تم اس کافر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو
جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خم دار ہو جائے

سحر لائے گی کیا پیغامِ بیداری شبستاں میں
نقابِ رُخ الٹ دو خود سحر بیدار ہو جائے

نظر اس حسن پر ٹھیرے تو آخر کس طرح ٹھیرے
کبھی جو پھول بن جائے کبھی رُخسار ہو جائے

کچھ ایسا دیکھ کر چپ ہوں بہارِ عالمِ امکاں
کوئی ایک جام پی کر جس طرح سرشار ہو جائے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

حامداللہ افسر

چاند

تم ندی پر جاکر دیکھو — جب ندی میں نہائے چاند
ڈبکی لگائے غوطہ کھائے — ڈر ہے ڈوب نہ جائے چاند
کرنوں کی ایک سیڑھی لے کر — چھم چھم اترا آئے چاند
جھولے میں پانی کی لہروں کے — کیا کیا پینگ بڑھائے چاند
جب تم اس کو پکڑنے جاؤ — بادل میں چھپ جائے چاند
پھر چپکے سے نکل کر دیکھے — اور پھر خود کو چھپائے چاند

چاہے جدھر کو جاؤ افسر
ساتھ تمھارے جائے چاند

مالن کا گیت

جی دکھتا ہے کیسے توڑوں
چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی پیاری پیاری کلیاں
لے کانٹے میں سچ سچ کہہ دوں
تیرے سارے پتے وتے میری ساری کلیاں
یا اللہ میں صبح کو پاؤں
ٹہنی ٹہنی اچھی اچھی بھاری بھاری کلیاں

مُسافر

ہو تنہا راہ میں گھبرائے گا دل ۔ کہاں ہو ای مسافر تیری منزل ؟
سحر کی سرخ لہروں میں نہا کر ۔ نظرِ مہرِ منور سے بچا کر
فضائے نیلگوں میں جب بڑھوں گا ۔ تو منزل کا پتا کچھ دے سکوں گا

سفر تیرا ہو مشکل ای مسافر ۔ ہو کتنی دور منزل ای مسافر ؟
مسافر ہوں سفر ہو میرا مقصود ۔ مری منزل مرے دل میں ہو موجود
سفر کی حد اگر معلوم ہوتی ۔ سفر کی کیفیت معدوم ہوتی
سفر میں رات کا کٹنا ہو دوبھر ۔ گزارے گا مسافر رات کیوں کر
زمیں سے آسماں تک رہ گزر ہو ۔ سفر کی رات ہی جانِ سفر ہو
خموشی کو صلائے درد دوں گا ۔ کہانی اپنی تاروں سے کہوں گا
فلک پر نور افگن ماہ ہوگا ۔ مسافر رات کا ہم راہ ہوگا

محبت میں ہیں دونوں داغ بر دل
مسافر ہیں مگر گم کردہ منزل

اکبر حسین اکبر الہ آبادی

برقِ کلیسا

رات اس مِس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار
ہائے وہ حسن، وہ شوخی، وہ نزاکت، وہ اُبھار
زلفِ پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گرفتار کریں
گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں
دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں
پہلوئے حسنِ بیاں شوخیٔ تقریر میں غرق
ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں غرق
ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا
یا حفیظ کا کیا وِرد مگر کچھ نہ ہوا
عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار
تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دُنیا کو مرے قلب سے سیری ہو جائے

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی
ناز انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی

غیر ممکن ہی مجھے اُنس مسلمانوں سے
بوے خوں آتی ہی اس قوم کے افسانوں سے

کوئی بنتا ہی جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

دشمنِ صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کام یابی کی دلِ زار نے آہٹ پائی

عرض کی میں نے کہ ای لذّتِ جاں راحتِ روح
اب زمانے میں نہیں ہی اثرِ آدم و نوح

شجرِ طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جاں باز کا رنگ
دل پہ غالب ہی فقط حافظِ شیراز کا رنگ

میرے اسلام کو اک قصّۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ "تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو"

پردہ

بٹھائی جائیں گی پردے میں بیبیاں کب تک
بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک

حرمِ سبزا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی
تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

بنائے ملّت

بنائے ملّت بگڑ رہی ہے لبوں پہ ہے جاں مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا اُبھر رہے ہیں
اُدھر ہے قوم ضعیف و مسکین اِدھر ہیں کچھ مرشدانِ خود بیں
یہ اپنی قسمت کو رو رہی ہے وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں
قفس ہے کم ہمتی کا سب میں پڑے ہیں کچھ دانہائے شیریں
اسی پہ مائل ہے طبعِ شاہیں نہ بال ہیں اب نہ پر رہے ہیں

کرزن سبھا

سبھا میں دوستو! کرزن کی آمد آمد ہے — گلوں میں غیرتِ گلشن کی آمد آمد ہے
رئیس و راجا و نوّاب منتظر ہیں بہ شوق — کہ نائبِ شہِ لندن کی آمد آمد ہے
چمک ہے کرچوں کی ہر سو گمک ہے توپوں کی — چھما چھم اور دنادن کی آمد آمد ہے
جو پیر ہیں انھیں ہیں ولولے جوانی کے — جوان ہیں تو لڑکپن کی آمد آمد ہے
گرہ میں زر نہیں اور ٹیم ٹام لازم و فرض
اسی سبب سے مہاجن کی آمد آمد ہے

اپنے فرزند سے

عشرتی گھر کی محبت کا مزہ بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے

موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی
چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

کیسے کیسے دلِ نازک کو دکھایا تم نے
خبرِ فیصلۂ روزِ جزا بھول گئے

نقلِ مغرب کی ترنگ آئی تمھارے دل میں
اور یہ نکتہ کہ مری اصل ہی کیا بھول گئے

قطعہ

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس

یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں
نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس

سناؤں تم کو ایک فرضی لطیفہ
کیا ہے جس کو میں نے زیبِ قرطاس

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو اگر کرلے ایم اے پاس

تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس

کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی
کجا عاشق کجا کالج کی بکواس

کجا یہ فطرتِ جوشِ طبیعت
کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس

بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے
ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی
مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرنداس

دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود
نہیں منظور مغزِ سر کا آماس

یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفا مرا باحسرت و یاس

غزل

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا — بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
بزم یاراں سے پھری بادِ بہاری مایوس — ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا
گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش — طالبِ زمزمۂ بلبلِ شیدا نہ ملا
واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے — کر دیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا
رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم — رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا
سیّد اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے — شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا

ہوشیاروں میں تو اک اک سے سوا ہیں اکبر
مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

متفرقات

شیخ کے پاس ہے اب صرف مصلّیٰ باقی — اور مرے پاس ہے اُردوئے معلّیٰ باقی

میرے منصوبے ترقی کے ہوئے سب پامال — بیج مغرب نے جو بویا وہ اُگا اور پھیل گیا

بوٹ ڈاسن نے بنایا اور میں نے ایک مضمون لکھا — ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

ہوئے اس قدر مہذّب کبھی گھر کا منہ دیکھا — کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

خواہاں نوکری نہ رہیں طالبانِ علم قائم ہوئی ہو رائے یہ اہلِ شعور کی

کالج میں دھوم مچ رہی ہو پاس پاس کی عہدوں سے آ رہی ہو صدا دور دور کی

پری کی زلف میں الجھا نہ ریشِ واعظ میں دلِ غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا

وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لیے خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

نیچری وعظ و تہذیب کو لیے پھرتے ہیں شیخ صاحب ہیں کہ مذہب کو لیے پھرتے ہیں
ہم کو ان تلخ مباحث سے سروکار نہیں ہم تو اک شوخ شکر لب کو لیے پھرتے ہیں

چپکوں میں دنیا سے کس طرح ہٹ عورت نے کہا کہ گوند ہوں میں
قومی چندے کدھر سمائیں کالج نے کہا کہ تو ند ہوں میں

چرخ نے پیشِ کمیشن کہہ دیا اظہار میں قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں
شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں بیبیاں اسکول میں اور شیخ جی دربار میں

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں
مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں ان کو دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

وہ فقط وضع کے کشتہ ہیں نہیں قید کچھ اور بھینس کو گون پنہا دیجیے عاشق ہو جائیں

مرزا غریب چھپ رہے ہیں ان کی کتاب ردی — بڈھا اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

مرغی نے کہا خوب کسی کیمپ میں لٹ کے — انڈا وہی اچھا ہے کہ بچہ نہ نکلے کھٹکے
دیوارِ شکستہ نے ترقی کی دعا کی — گردوں کی عنایت سے سڑک بن گئی کٹ کے

ہر چند کہ ہے سس کا لونڈر بھی بہت خوب — بیگم کا مگر عطرِ حنا اور ہی کچھ ہے
سائے کی بھی سن سن ہوس انگیز ہے لیکن — اس شوخ کے گھنگرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

جو پوچھا مجھ سے دورِ چرخ نے کیا تو مسلماں ہے
میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا رمز پنہاں ہے
کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے
اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ
ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے غافلاں ہے

سمجھا رہے تھے مجھ کو کمٹا کی وہ گردشیں — خود کر رہے تھے تاک کی ٹٹی سے سازشیں

نقشے میں دیکھتا تھا وہ پیتے تھے جام سے — میں نے کہا حضور یہ مضمون عجیب ہے

ہیں خود تو مستِ بادۂ عشرت کے خم سے آپ — الجھا رہے ہیں مجھ کو ستاروں کی دُم سے آپ
پھر [illegible] سنا کر شعر اور بھی — میں نے کہا یہ بات [illegible]

اللہ رے ارتقائے سگانِ درِ حضور
کل تُو سے تم ہوئے تھے ہوئے آج تم سے آپ

ہنس کر کہا انھوں نے اُلٹ بحث کا ورق
گانے لگے وہ گیت میں پڑھنے لگا سبق

حسرت بہت ترقیٔ دختر کی تھی انھیں
پردہ جو اُٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

ڈائری میں ہو گیا تھا اختلافِ اندراج
لڑ گئے خفیہ پولیس سے کل کراماً کاتبین

شانِ نمازِ اکبر شاہانہ ہو چکی ہے
مسجد الگ بنائیں اپنی میاں وفائی

شعرِ اکبر کو سمجھ لو یادگارِ انقلاب
یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

نمبر علی مراد نہیں یا سکھ نران ہیں
لیکن معائنے کو وہی نا پران ہیں

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں
معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے
شہرِ تن میں جب کہ خود اپنا پتا ملتا نہیں

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

برق گر جائے گی اک دن اور اڑ جائے گی بھاپ　　دیکھنا اکبر بچائے رکھنا اپنے آپ کو

ایسا شوق نہ کرنا اکبر　　گورے کو نہ بنانا بالا
بھائی رنگ یہی ہی اچھا　　ہم بھی کالے یار بھی کالا

کہتی ہی زراہِ کبر مجھ سے وہ گرل　　کیا تجھ سے ملوں کہیں کا تو ڈیوک نہ ارل
اکبر نے کہا دکھا کے داغ دل و اشک　　ہی میری گرہ میں بھی یہ روبی، یہ پرل

کوٹھی میں جمع ہیں نہ ڈپارٹ ہی مینکس میں　　قلاش کر دیا مجھے دو چار تھینکس میں

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہی جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہی خدا کا اس زمانے میں

مذہب نے پکارا ای اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں　　کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

ابھی انجن گیا ہی اس طرف سے　　کہے دیتی ہی تاریکی ہوا کی
رہا رات ایشیا غفلت میں سوتا　　نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی

بہت شوق انگریز بننے کا ہے
تو چہرے پہ اپنے گلٹ کیجیے
اجل آئی اکبر گیا وقتِ بحث
اب اُف کیجیے اور نہ ہٹ کیجیے

ممکن نہیں ای مس ترا نوٹس نہ لیا جائے
گال ایسے پریزاد ہوں اور کس نہ لیا جائے

جب کہا گیسو کا بوسہ دیجیے دل لیجیے
ہنس کے بولے آپ کو سودا ہی سہل لیجیے

میں ہوا رخصت اُن سے ای اکبر
وصل کے بعد تھینک یو کہہ کر

کیا پوچھتے ہو اکبرِ آشفتہ سر کا حال
خفیہ پولیس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

نہ لیسنس ہتھیار کا ہے نہ زور
کہ ٹرکی کے دشمن سے جا کر لڑیں
تہِ دل سے ہم کوستے ہیں مگر
کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

غنیمت ہے شبِ فرقت کی فرصت
رسالہ لکھیے تحقیق کمر میں

وصل کا اس بتِ خود بیں سے کوئی ہنٹ کہاں
صرف بوسے میں بھلا سلف گورمنٹ کہاں

قوم کے غم میں ڈنر کھاتا ہے حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

حقیقی اور مجازی شاعری میں فرق یہ پایا
کہ وہ جامے سے باہر ہو یہ پاجامے سے باہر

غمِ ملّت

وہ ہوا نہ رہی وہ چمن نہ رہا وہ گلی نہ رہی وہ حسیں نہ رہے
وہ فلک نہ رہا وہ سماں نہ رہا وہ مکاں نہ رہا وہ مکیں نہ رہے
نہ گلوں میں گلوں کی سی بو وہ رہی نہ عزیزوں میں لطف کی خو وہ رہی
نہ حسینوں میں رنگِ وفا وہ رہا کہیں اور کی کیا وہ ہمیں نہ رہے
نہ وہ آن رہی نہ وہ امنگ رہی نہ وہ رندی و زہد کی جنگ رہی
سوئے قبلہ نگاہوں کے رخ نہ رہے درِ دیر پہ نقشِ جبیں نہ رہے
نہ وہ جام رہے نہ وہ مست رہے نہ فدائے عہدِ الست رہے
وہ طریقہ کارِ جہاں نہ رہا وہ مشاغلِ رونقِ دیں نہ رہے

تغیّرِ عظیم

جب یاس ہوئی تو آہوں نے سینے سے نکلنا چھوڑ دیا
اب خشک مزاج آنکھیں بھی ہوئیں دل نے بھی مچلنا چھوڑ دیا
ناوک فگنی سے ظالم کی جنگل میں ہے اک سناٹا سا
مرغانِ خوش الحاں ہو گئے چپ آہوں نے اچھلنا چھوڑ دیا
وہ سوز و گداز اس محفل میں باقی نہ رہا اندھیر ہوا
پروانوں نے جلنا چھوڑ دیا شمعوں نے پگھلنا چھوڑ دیا

قطعہ

تو وضع پہ اپنی قائم رہ قدرت کی مگر تحقیر نہ کر
دے پائے نظر کو آزادی خود بینی کو زنجیر نہ کر

گو تیرا عمل محدود ہوا اور اپنی ہی حد مقصود رہے
رکھ ذہن کو ساتھی فطرت کا بند اس پہ در تاثیر نہ کر

باطن میں ابھر کر ضبط فغاں لے اپنی نظر سے کارِ زباں
دل جوش میں لا فریاد نہ کر تاثیر دکھا تقریر نہ کر

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملکِ عدم ہوں گے — نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی — نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے صنم اپنی — نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملت سے — نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی — لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا — ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے

تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

امجد حسین امجد حیدرآبادی

انتخابِ رباعیات

گرمی میں غمِ لبادہ نازیبا ہے — مستی میں خیالِ بادہ نازیبا ہے
کافی ہے ضرورت کے مطابق دنیا — بادہ حد سے زیادہ نازیبا ہے

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے — مانندِ حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات پر فکرِ حسین — تنکا تھوڑی سی ہوا سے اُڑ جاتا ہے

ہر قطرے میں بحرِ معرفت مضمر ہے — ہر اک ذرے میں کچھ نہ کچھ جوہر ہے
ہو چشمِ بصیرت تو ہے ہر چیز اچھی — گر آنکھ نہ ہو تو لعل بھی پتھر ہے

سرمایۂ علم و فضل کھویا میں نے — سب دفترِ پارینہ ڈبویا میں نے
بس آج تری خاکِ پا تیمم کے لیے — اے دوست وضو سے ہاتھ دھویا میں نے

جو معنیٔ مضموں ہے وہی عنواں ہے — واجب ہی میں ایک صورتِ امکاں ہے
محشر ہو کہ قبر، زندگی ہو کہ ہو موت — جو یاں ہے وہاں ہے جو وہاں ہے یاں ہے

مر مر کے لحد میں میں نے جا پائی ہے — یاں تک مجھے تیری ہی کشش لائی ہے

آ اے میرے منہ چھپانے والے آجا
خلوت ہے شبِ تار ہے تنہائی ہے

اس جسم کی کینچلی میں اک ناگ بھی ہے
آوازِ شکستہ دل میں اک راگ بھی ہے
بے کار نہیں بنا ہے ایک تنکا بھی
خاموش دیا سلائی میں آگ بھی ہے

یہ سنگ نشاں ہے منزلِ وحدت کا
پیدا ہوا پھر کوئی اس صورت کا
انسان جسے کہتے ہیں دنیا والے
قدِ آدم ہے آئینہ قدرت کا

ہر ذرے پہ فضلِ کبریا ہوتا ہے
اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دبی زبان سے یہ کہتے ہیں
وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

بے نظیر شاہ

تارے

کہاں ہو تو اے ساقیٔ بزم زیب
کہ تاروں بھری رات ہو دل فریب

کواکب یہ افلاک پھولے ہوئے
کنول حوضِ گردوں میں پھولے ہوئے

سمندر میں بہتے ہوئے یہ چراغ
بنے صحنِ گردوں میں تاروں کا باغ

نہیں چاند کا گو فلک پر نزول
کھلے ہیں مگر چاندنی کے یہ پھول

سنہری سجی قدرتِ پاک کی
لسی سیج پھولوں سے افلاک کی

قنادیل روشن عجائب نگار
مصابیح آیاتِ پروردگار

ستاروں کا یہ عکس تالاب میں
کہ لہراتی ہیں بجلیاں آب میں

تناسب سے قدرت نے چھوٹے بڑے
زبرجد کے گنبد میں ہیرے جڑے

یہ خورشید تاباں کے آنکے ہوئے
گہر چترِ گردوں میں ٹانکے ہوئے

غضب جگمگاتی ہوئی قمریاں
بنا کامدانی کا تھان آسماں

بھری بوٹیوں سے رداے فلک
بنی بیل خود کہکشاں کی سڑک

شب تار کی شال تانے ہوئے
جہاں نیند کی دل میں ٹھانے ہوئے

مگر چشمِ انجم جھپکتی نہیں
ستاروں کی بوندیں ٹپکتی نہیں

کچھ ایسا ہی خوشِ شب تار ہو
کہ ہر نجم اک چشم بیدار ہو

کھلے کوہ پایہ سرِ کوہسار
کہ شبنم سے بھیگا ہوا سبزہ زار

جو سیارے رہتے ہیں ان میں رواں
وہ ہیں اُن کی ترتیب کے پاسباں

جو ثابت ہیں محور بدلتے نہیں
کہ گرد اپنے بھرتے ہیں چلتے نہیں

مرتب جو یہ شکل تنجیم ہو
مہ و سال کی اُن سے تقسیم ہو

ہوا بوجھ سب کا سنبھالے ہوئے
فضا میں کُروں کو اچھالے ہوئے

بہم ان میں جو ربطِ جذب بات ہو
علی قدر جسم و مسافات ہو

کشش ان میں ہو اور تاثیر بھی
جدا گانہ تکثیف و تنویر بھی

کچھ آباد کچھ ان میں خالی بھی ہیں
جلالی بھی ہیں کچھ جمالی بھی ہیں

وسیع اس قدر ہو فضائے جہاں
ہیں ذرّوں سے کم یہ کُرے بے گماں

تپش دن کو خورشیدِ تاباں کی تھی
خبر کس کو اس بزمِ شایاں کی تھی

فضا آبِ انجم سے دھوئی ہوئی
شبِ ماہ حیرت میں کھوئی ہوئی

آمدِ ابر

گھٹا اودی اودی سی کیا چھا گئی
بہارِ چمن رنگ پر آ گئی

پروں کو اِدھر مور تولے ہوئے
گھٹائیں اُدھر بال کھولے ہوئے

وہ کویل غضب نَے بجاتی ہوئی
پپیہوں سے تانیں لڑاتی ہوئی

ہوا دوش پر شال ڈالے ہوئے
گھٹاؤں کے آنچل سنبھالے ہوئے

گھٹا میں وہ بگلوں کی ہر سو قطار
کہ ظلمت میں ہیں آبِ حیات آشکار

سیاہی میں ہیں یہ اجلی اجلی لکیر
رواں دامنِ کوہ میں جوئے شیر

یہ کہسار میں راہ چھوٹی ہوئی
سڑک سنگِ مرمر کی کوٹی ہوئی

زمین و فلک پر ہو مستی کا شور
گرجتے ہی بادل کے چلّائے مور

کبھی ابر گریاں کبھی خندہ زن
ہو دیوانے کا سوانگ چرخِ کہن

فلک پر گرجتا ہو ابرِ مطیر
زمیں پر نہ کیوں رند گائیں کبیر

ثاقب لکھنوی

غزل

کسی کا رنج دیکھوں یہ نہیں ہوگا مرے دل سے
نظر صیاد کی جھپکے تو کچھ کہہ دوں عنادل سے

چل اے ہمدم ذرا سازِ طرب کی چھیڑ بھی سن لیں
اگر دل بیٹھ جائے گا تو اُٹھ جائیں گے محفل سے

امید و ناامیدی کا بہم ہونا وہی جانے
کہ جس نے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہو ساحل سے

نہ سمجھا معنیٔ گور و کفن سمجھا تو یہ سمجھا
تھکا تھا میں لپٹ کر سو رہا دامانِ منزل سے

تڑپتا ہوں شبِ غم یوں کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا
بتا دے نامرادی کون سی باتیں کروں دل سے

اِدھر میں سر بکف پہنچا عدالت گاہِ محشر میں
لہو کی بوند اِدھر آنے لگی دامانِ قاتل سے

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہم راہ منزل سے

مری آنکھیں لہو روتی رہیں تو اس کی پرسش کیا
یہ پوچھو خون کیوں برسا کیا ابروئے قاتل سے

غموں کے آسرے پر ہجر میں کٹتی زندگی ثاقب
خلش بڑھتی جو یہ کانٹے نکلتے دامنِ دل سے

غزل

ہجر کی شب نالۂ دل وہ سزا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے

آئیے حالِ دلِ مجروح سنیے دیکھیے
کیا کیا زخموں نے کیوں ٹانکے صدا دینے لگے

کس نظر سے آپ نے دیکھا دلِ مجروح کو
زخم جو کچھ بھر چلے تھے پھر ہوا دینے لگے

سننے والے رو دیے سن کر مریضِ غم کا حال — دیکھنے والے ترس کھا کر دعا دینے لگے
جز زمینِ کوئے جاناں کچھ نہیں پیشِ نگاہ — جس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن — زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے
آئینہ ہو جائے میرا عشق ان کے حسن کا — کیا مزہ ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

سینۂ سوزاں میں ثاقب گھٹ رہا ہے وہ دھواں
اُف کروں تو آگ دنیا کی ہوا دینے لگے

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے — جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے
ہجومِ تمنا سے گھٹتے تھے دل میں — جو میں روکتا بھی تو نالے نہ رہتے
نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی — ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے
بتاتے ہیں آنسو کہ اب دل نہیں ہے — جو پانی نہ ہوتا تو دریا نہ بہتے
زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا — زمانہ ہوا مجھ کو چپ رہتے رہتے

مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقب
کنارے پہ آ ہی لگی بہتے بہتے

مری قید کا دل شکن ماجرا تھا — بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا
میں دنیا کو جو فسانہ سمجھا کہ اس میں — کوئی ہنس رہا تھا کوئی رو رہا تھا
شبِ غم کی تنہائیوں کو نہ پوچھو — جدھر دیکھتا تھا خدا ہی خدا تھا

روتے روتے شام ہوئی ہے کب تک اشک بہائیں گی
بہتے بہتے تھمتے ہیں دریا آنکھیں بھی تھم جائیں گی

جاتے جاتے جسم سے جائیں اہلِ وفا کی جائیں گی
آتے آتے دل لینے کی تم کو راہیں آئیں گی

چونکو چونکو صبح پیری غفلت خوابِ جوانی سے
اٹھو اٹھو سونے والو راتیں پھر بھی آئیں گی

لاتے لاتے کام میں الفت لائے گی زنجیروں کو
بڑھتے بڑھتے زلفیں تیری طوقِ کمر ہو جائیں گی

ہوتے ہوتے ہو گا ظالم واقف رسمِ الفت سے
رفتہ رفتہ میری وفائیں راہ پہ اس کو لائیں گی

جگر مرادآبادی

غزل

اب کہاں زمانے میں دوسرا جواب اُن کا
فصلِ حسن ہے ان کی موسمِ شباب اُن کا

عرضِ شوق پر میری پہلے کچھ عتاب اُن کا
خاص اک ادا کے ساتھ اُف وہ پھر حجاب اُن کا

ہم سے پوچھ اے ناصح دل گرفتگی اُن کی
ہم نے چھپ کے دیکھا ہے عالمِ پُرآب اُن کا

پھول مسکراتے ہیں دل پہ چوٹ پڑتی ہے
ہائے وہ رُخِ خنداں اُف رے وہ شباب اُن کا

کیا اسی کو کہتے ہیں ربط و ضبطِ حسن و عشق
شوقِ نارسا اپنا نازِ کامیاب اُن کا

ضبط کا جنھیں دعویٰ عشق میں رہا اکثر
ہم نے حال دیکھا ہے بیشتر خراب اُن کا

کہیے حالِ دل لیکن دیکھیے کن آنکھوں سے
ہر سکوں کے پردے میں حشر اضطراب ان کا

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی
ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب اُن کا

تو جگر سے مستوں پر طعن کر نہ ای واعظ
تو غریب کیا جانے مسلکِ شراب اُن کا

غزل

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی
وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی

کہاں وہ شوخ ملاقات خود سے بھی نہ ہوئی
بس ایک بار ہوئی اور پھر کبھی نہ ہوئی

کوئی بڑھے نہ بڑھے ہم تو جان دیتے ہیں
پھر ایسی چشمِ توجہ ہوئی ہوئی نہ ہوئی

فسردہ خاطریٔ عشق اگر معاذ اللہ
خیالِ یار سے بھی کچھ شگفتگی نہ ہوئی

تری نگاہِ کرم کو بھی آزما دیکھا
اذیتوں میں نہ ہوئی تھی کچھ کمی نہ ہوئی

صبا یہ ان سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی ان سے آہ بھی نہ ہوئی

خیالِ یار سلامت تجھے خدا رکھے
ترے بغیر کبھی گھر میں روشنی نہ ہوئی

گئے تھے ہم بھی جگرؔ جلوہ گاہ جاناں میں
وہ پوچھتے ہی رہے ہم سے بات بھی نہ ہوئی

شکستِ توبہ

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا
سرمستیٔ ازل جو مجھے یاد آ گئی
دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا
آزردگیٔ خاطرِ ساقی کو دیکھ کر
مجھ کو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا
اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا
پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا
اس جانِ میکدہ کی قسم بارہا جگرؔ
کُل عالمِ بسیط پہ میں چھا کے پی گیا

تصویر و تصوّر

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں
وہی قیامت ہے قدِّ بالا، وہی ہے صورت وہی سراپا
لبوں کو جنبش، نگہ کو لرزش کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں
خرام رنگیں نظام رنگیں، پیام رنگیں کلام رنگیں
قدم قدم پر روش روش پر نئے نئے گُل کھلا رہے ہیں

تمام رعنائیوں کے منظر تمام رنگینیوں کے مظہر
سنبھل سنبھل کر سمٹ سمٹ کر سب ایک مرکز پہ آرہے ہیں

بہار رنگ و شباب ہی کیا ستارہ و ماہتاب ہی کیا
تمام ہستی جھکی ہوئی ہے جدھر وہ نظریں جھکا رہے ہیں

طیور سرشارِ ساغرِ مُل ہلاکِ تنویرِ لالہ و گل
سب اپنی اپنی دُھنوں میں مل کر عجب عجب گیت گا رہے ہیں

شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے نظر سے مستی اُبل رہی ہے
چھلک رہی ہے اچھل رہی ہے پیے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں

وہ روئے رنگین و موجۂ یم کہ جیسے دامانِ گل پہ شبنم
یہ گرمیٔ حسن کا ہے عالم عرق عرق ہیں نہا رہے ہیں

یہ مست بلبل بہک رہی ہے کنار عارض چہک رہی ہے
گلوں کی چھاتی دھک رہی ہے وہ دستِ رنگیں بڑھا رہے ہیں

یہ موج و دریا یہ ریگ صحرا یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دیے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں

ذرا جو دم بھر کو آنکھ جھپکی یہ دیکھتا ہوں نئی تجلّی
طلسمِ صورت مٹا رہے ہیں جمالِ معنی بنا رہے ہیں

خوشی سے لبریز شش جہت ہے زبان پر سوزِ تہنیت ہے
یہ وقت وہ ہے جگر کے دل کو وہ اپنے دل سے ملا رہے ہیں

کدھر ہے تیرا خیال اے دل یہ وہم کیا کیا سما رہے ہیں
نظر اٹھا کر تو دیکھ ظالم کھڑے وہ کیا مسکرا رہے ہیں

تمام ہستی پہ چھا رہے ہیں وہ جیسے خود ہی بنا رہے ہیں

نظر نظر میں سما چکے ہیں نفس نفس میں سما رہے ہیں
کہاں کی دید اور کس کا عرفاں حواس گم ہیں نظر پریشاں
جو ایک پردہ اٹھا رہے ہیں تو لاکھ پردے گرا رہے ہیں
یہ حادثاتِ زمانہ کیا ہیں اسی کے حسن و طلب کے جلوے
دلوں کو ٹھوکر لگا لگا کر دلوں کی دُنیا جگا رہے ہیں
کرشمے ہیں حسنِ بے جہت کے فنون ہیں چشم مناسبت کے
اِدھر سے دیکھو تو آ رہے ہیں اُدھر سے دیکھو تو آ رہے ہیں
نفس نفس میں صفات تازہ ممات تازہ حیات تازہ
انھیں میسر ہی ذات تازہ جو خود کو تجھ میں مٹا رہے ہیں
ہماری ہستی تمام آفت تمام زحمت تمام کلفت
اگر یہ سچ ہی تو فی الحقیقت ہمیں خود ان کو ستا رہے ہیں
ہوا کچھ ایسی ہی چل گئی ہی دلوں کی دنیا بدل گئی ہی
وہ ہم کو مطلوب کہ رہے ہیں ہم ان کو طالب بتا رہے ہیں
ذرا سا اِک وقفۂ محبت اٹھا گیا اور ہی قیامت
ابھی ہم آنسو بہا رہے تھے ابھی وہ آنسو بہا رہے ہیں

ساحل کے لب سے پوچھو دریا کے دل سے پوچھو
اک موجِ تہ نشیں کا مدت کے بعد ابھرنا

مانا غرورِ عشق بھی اک چیز ہی مگر ، اتنے بھی دور دور ترے آستاں سے کیا

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصلِ بہار پر

دل تو سینہ ہی میں رہتا ہے مگر اس کے حضور
جیسے اب جاتا ہے دل سینے سے اب جاتا ہے دل

اس سے بھی شوخ تر ہیں اس شوخ کی ادائیں
کر جائیں کام اپنا لیکن نظر نہ آئیں

قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی
جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں

ہائے یہ مجبوریاں محرومیاں ناکامیاں
عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو ہم کیا کریں

بیتاب ہے مجھ کو اب ہے معلوم نہیں کیوں
دل ماہیِ بے آب ہے معلوم نہیں کیوں

بے کیفیِ ہستی نا سب ہے معلوم نہیں کیوں
پھیکی شبِ مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں

بے نام کی اک یاد ہے کیا جانیے کس کی
بے وجہ تب و تاب ہے معلوم نہیں کیوں

دیکھا تھا کبھی خواب سا معلوم نہیں کیا
اب تک اثرِ خواب ہے معلوم نہیں کیوں

محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیّر
مرے لیے بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں

دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن
کشتی سی تہِ آب ہے معلوم نہیں کیوں

کچھ تو زمان و مکاں کچھ نہ سپید و سیاہ
اشہد ان لا الٰہ اشہد ان لا الٰہ

عشق نظر آفریں اور نظر معصیت
عشق تمنا نژاد اور تمنا گناہ

حاصلِ صد عرضِ غم مایۂ صد عرضِ شوق
اک مترنم سکوت اک متبسم نگاہ

کون تجھے پا سکے کس کو ہی یہ دست گاہ — عشق سو گم کردہ ہوش عقل سو گم کردہ راہ
اس کے سوا اور کیا پیش کشِ حسنِ دوست
ایک دھڑکتا سا دل ایک لرزتی سی آہ

شوق کو رہ نما بنا، ہو چکا کبھی نہ دیکھ — آگ دبی ہوئی نکال آگ بجھی ہوئی نہ دیکھ

نگہِ یار کے مخصوص اشاروں کے سوا — مذہبِ عشق میں ہی کفر نہ ایماں کوئی

دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں — کچھ خوشی بھی ہو کچھ ملال بھی ہی

کیا جانیے کب آہ کی تاثیر جاگ اٹھے — گہری نگاہ سے مجھے دیکھا نہ کیجیے

انھیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم — پیامِ دردِ دل ہی اور آنکھوں کی زبانی ہی

مانوسِ اعتبارِ کرم کیوں کیا مجھے — اب ہر خطائے شوق اسی کا جواب ہی

اک لفظِ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہی — سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہی
کیا حسن نے سمجھا ہی کیا عشق نے جانا ہی — ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہی
آنکھوں میں نمی سی ہی چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں — نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہی
یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے — اک آگ کا دریا ہی اور ڈوب کے جانا ہی

کچھ جو پشیمان جفا ہو گئے   اور وہ گھبرا کے خفا ہو گئے

وہ عالم ہو اب خشک آنکھوں میں اپنی   کہ طوفاں ہو برپا روانی نہیں ہو

اس نے شانوں پہ زلف برہم کی   خیر یا رب نظامِ عالم کی
یوں تو پیاسے ہیں سبزہ و گل بھی   کس نے دیکھی ہو پیاس شبنم کی
آئی تھی آج بھی نسیمِ سحر   آگ بھڑکا گئی جہنم کی
اللہ اللہ ہستیٔ شاعر   قلب غنچے کا آنکھ شبنم کی

حسن کامل ہو ترا اور بھی کامل ہو جائے   میری گستاخ نگاہی بھی جو شامل ہو جائے

شکرِ شباب و یادِ یار درد فراق و انتظار   آنکھ کھلی سُلا دیا آنکھ لگی جگا دیا

جوشؔ ملیح آبادی

حُسن اور مزدوری

ایک دوشیزہ سڑک پر دھوپ میں ہے بے قرار
چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹنے میں بار بار
چوڑیوں کے ساز میں یہ شور ہے کیسا بھرا
آنکھ میں آنسو بنی جاتی ہے جس کی ہر صدا
گرد ہے رخسار پر زلفیں اٹی ہیں خاک میں
نازکی بل کھا رہی ہے دیدۂ غمناک میں
ہو رہا ہے جذب مہرِ خوں چکاں کے رو برو
کنکروں کی نبض میں اُٹھتی جوانی کا لہو
دھوپ میں لہرا رہی ہے کاکلِ عنبر سرشت
ہو رہا ہے کمسنی کا سوچ جزوِ سنگ و خشت
پی رہی ہیں سرخ کرنیں مہرِ آتش بار کی
نرگسی آنکھوں کا رس مے چینئ رخسار کی
غم کے بادل خاطرِ نازک پہ ہیں چھائے ہوئے
عارضِ رنگیں ہیں یا دو پھول مرجھائے ہوئے
چیتھڑوں میں دیدنی ہے روئے غمگینِ شباب
ابر کے آوارہ ٹکڑوں میں ہو جیسے ماہتاب

اُف یہ ناداری مرے سینے سے اٹھتا ہے دھواں
آہ اے افلاس کے مارے ہوئے ہندوستاں
حسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے
دستِ نازک اور پتھر توڑنے کے واسطے
فکر سے جھک جائے وہ گردن تمنائی لیل و نہار
جس میں ہونا چاہیے پھولوں کا اک ہلکا سا ہار
آسماں جانِ طرب کو وقفِ رنجوری کرے
صنفِ نازک بھوک سے تنگ آ کے مزدوری کرے
بھیک میں وہ ہاتھ اٹھیں التجا کے واسطے
جن کو قدرت نے بنایا ہو حنا کے واسطے
نازکی سے جو اٹھا سکتی نہ ہو کاجل کا بار
ان سبک پلکوں پہ بیٹھے راہ کا بوجھل غبار
کیوں فلک مجبور ہو ان آنسو بہانے کے لیے
انکھڑیاں ہوں جو دلوں میں ڈوب جانے کے لیے
مفلسی چھانٹے اسے قہر و غضب کے واسطے
جس کا مکھڑا ہو شبستانِ طرب کے واسطے
فرطِ خشکی سے وہ لب ترسیں تکلم کے لیے
جن کو قدرت نے تراشا ہو تبسم کے لیے
دستِ نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیے

غزل

قدم انساں کا راہِ دہر میں تھرا ہی جاتا ہے
چلے کتنا ہی کوئی بچ کے ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے
نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا پھر بھی
ہجومِ کشمکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے
خلافِ مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں مگر ناصح
وہ آتے ہیں تو چہرے پر تغیر آ ہی جاتا ہے
ہوائیں زور کتنا ہی لگائیں آندھیاں بن کر
مگر جو گھر کے آتا ہے وہ بادل چھا ہی جاتا ہے
شکایت کیوں اسے کہتے ہو یہ فطرت ہے انساں کی
مصیبت میں خیالِ عیشِ رفتہ آ ہی جاتا ہے
شگوفوں پر بھی آتی ہیں بلائیں یوں تو کہنے کو
مگر جو پھول بن جاتا ہے وہ کھلا ہی جاتا ہے
سمجھتی ہیں مآلِ گل مگر کیا زورِ فطرت ہے
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

فریبِ ہستی

چمن کی خاک نے تا دیر کی عرق ریزی — کہ گھٹ کے آرزوئے تخمِ گل نہ رہنے پائے
مٹا کے نقشِ وجودِ صیدِ رنگ و بو کے لیے — ہزار جال سے بُن کر زمیں کی تہ میں بچھائے

کتنا فتوں میں لطافت کی شمع روشن کی — نمو کے ظلمتِ افسردہ میں چراغ جلائے
گھٹا کی جیب تراشی فضا پہ ڈالے دام — قدم پہ شمس کے تڑپی قمر کے ناز اٹھائے
گزشتہ زہرہ جبینوں کے دل نشیں ذرّات — نفس کی لو پہ بڑے اہتمام سے پگھلائے
دیے گئے تھے نباتات کو جو روزِ ازل — کمالِ حسن و لطافت سے وہ سبق دہرائے
جمالِ خاک نشیں کو دکھائی راہِ فلک — جمود زیرِ زمیں کو نپش نے راہ بتائے
تری زمین سے لی آسمان سے گرمی — صبا سے عطر نچوڑا کرن سے رنگ چرائے
بھگو کے رنگ میں ذرّات کی بنائیں تہیں — اور ان تہوں میں تکلّف کے ساتھ نقش بٹھائے
گرہ لگائی پھر اک مثلِ نرگسِ مخمور — اور اس طرح کہ ہواؤں کی رَو میں کھلتی جائے
اور ان تمام مراحل کے بعد ایک کلی — چمن فروز ہوئی پتیوں سے منہ کو چھپائے
اور اس کے بعد جو دیکھا تو شام کے ہنگام — پڑی ہوئی تھی سرِ خاک نا وکِ غم کھائے
یہ کیا نظام ہے معبود! باغِ ہستی کا — کھلے جو صبح کو وقتِ غروب کھلا جائے
جب ایک پل میں ہو تعمیرِ ماہ و سال خراب — تو کس امید پہ کوئی فریبِ ہستی دکھائے

"بیا کہ قصرِ امل سخت سست بنیاد است
بیا و بادہ کہ بنیادِ عمر بر باد است" (حافظ)

سونے کی تلوار

کل پھر رہا تھا صحنِ چمن میں کشاں کشاں — اپنی ادھیڑ زوجہ کے ہمراہ اک جواں
شوہر کی بے وسیلہ جوانی پہ الاماں — بیوی کے مال دار بڑھاپے کی سختیاں
لے مال و زرِ شباب کا تھا شیب پر مدار
تھیں جھرّیاں جو زوجہ کے چہرے پہ بیش و کم — ان جھرّیوں کی راہ پہ چاندی کے تھے قدم

شوہر کے عارضوں میں بہ افراطِ رنج و غم سویا ہوا تھا سازِ جوانی کا زیر و بم
گاتی ہوئی خزاں تھی سسکتی ہوئی بہار

پانی کی ایک بوند سے مرعوب تھا شرر حیران شکوہِ قطرۂ شبنم سے تھا گہر
چھالے کے طمطراق سے لرزاں تھا نیشتر ذرّے پہ آفتاب جھکائے ہوئے تھا سر
کم زوریوں کے زور پہ حاصل تھا اقتدار

ٹھنڈی ہوا سے وجد میں تھی روحِ بوستاں سرشار ہو چلی تھی زمیں مست آسماں
زوجہ کے ساتھ تھا شوہر رواں دواں اک موڑ پر مڑے ہی تھے دونوں کہ ناگہاں
گزری ادھر سے ہو کے اک آئینہ رُو نگار

اس طرح جیسے ناؤ کوئی ڈولتی ہوئی ابرو کے بل سے دل کی گرہ کھولتی ہوئی
تلوار سی ہر ایک لچک تولتی ہوئی گاتی ہوئی ادائیں نظر بولتی ہوئی
زلفوں کے پیچ و خم میں لیے موجِ آبشار

شوہر کی اُٹھ کے جم گئی اس شوخ پر نگاہ پلکوں نے سسکیاں سی بھریں اور نظر نے آہ
چمکی نگاہِ زوجہ میں شمشیرِ اشتباہ پیدا ہوئی وہ آگ کہ اللہ کی پناہ
آفت کی کش مکش تھی قیامت کا خلفشار

رحمت سے آس جیسے گنہ گار توڑ دے کوئی بہک کے ساغرِ سرشار توڑ دے
گھبرا کے جیسے دم کوئی بیمار توڑ دے جس طرح کوئی جنگ میں تلوار توڑ دے
شوہر نے یوں جھکائی کمر ہو کے شرمسار

اتنا ڈرا غریب کہ تپنے لگا جگر بیگانہ وار آنکھ اٹھائی اِدھر اُدھر
گردن ہلائی بیوی نے غصّے سے دیکھ کر یعنی متاعِ زوجہ نے شوہر کے حلق پر
سونے کی بڑھ کے پھیر دی شمشیرِ آب دار

بھٹکی ہوئی نیکی

ہر شے کو مسلسل جنبش ہے راحت کا جہاں میں نام نہیں
اس عالمِ سعی و کاوش میں دم بھر بھی کہیں آرام نہیں
چھائی ہے فضا پر تشنہ لبی مفقود یہاں سیرابی ہے
ہر جسم میں اک بے چینی ہے ہر روح میں اک بے تابی ہے
اس بزمِ خلش کا ہر ذرّہ بے چینیوں کے انبوہ میں ہے
اک رعشۂ پیہم کاہ میں ہے اک لرزشِ پنہاں کوہ میں ہے
لیلائے سماعت مضطر ہے عشرت کے ترانے سننے کو
ہر نقص کا دامن پھیلا ہے تکمیل کی کلیاں چننے کو
ہیجان ہے چشمِ پستی میں رفعت کا نوشتہ پڑھنے کا
ایک دُھن ہے ترقی کرنے کی اک جوش ہے آگے بڑھنے کا
ہر موم کو دھن ہے شمع بنے مضطر ہے پگھل جانے کے لیے
ہر سنگ کا سینہ جلتا ہے آتش میں بدل جانے کے لیے
انگاروں پہ شعلے لوٹتے ہیں بجلی پہ تفوق پانے کو
چنگاریاں مرغِ بسمل ہیں تاروں کی جگہ کھل جانے کو
بے چین بگولہ رقصاں ہے آندھی پہ شرف پانے کے لیے
جو موج ہے پیچ و تاب میں ہے دھارے سے الجھ جانے کے لیے
ہر قطرۂ دریا غلطاں ہے موتی پہ تسلّط پانے کو
ہر ذرّہ خاکی اڑتا ہے خورشید سے ٹکّر کھانے کو
ہر دل میں غرض اک کاہش ہے اُمّید کا ساغر بھرنے کی

ہر شے کی تڑپتی فطرت میں خواہش ہے ترقی کرنے کی
وہ چور جو شب کے پردے میں سرقے کی غرض سے آتا ہے
جو نیند کی ماتی بستی پر ظلمت کی طرح چھا جاتا ہے
اک ایسی ہی خواہش اس کو بھی چوری کے لیے اکساتی ہے
جس طرح کی خواہش نورانی دیوتاؤں میں پائی جاتی ہے
سارق بھی فرشتوں ہی کی طرح تسکین و طرب کا جویا ہے
ہر چند کہ اس نے قسمت سے تسکین کا رستہ کھویا ہے
رہبر ہو کہ رہزن دونوں میں تسکین کی خواہش یکساں ہے
ہر چند وہ سیدھی راہ پہ ہے یہ راہ بھٹک کر حیراں ہے
عارف نے یہ سمجھا آسایش اشکوں کو گرا کے ملتی ہے
قاتل نے یہ سمجھا انساں کا وہ خون بہا کر ملتی ہے
صوفی نے یہ سمجھا وہ دل کے پیمانے میں مل جائے گی
مے کش کی سمجھ میں یہ آیا مے خانے میں مل جائے گی
پس ذوقِ طرب میں جو انساں رہتا ہے سدا مے خانوں میں
ہے اصل میں وہ بھی دنیا کے معصوم ترین انسانوں میں
جال اس پہ نہ ڈال اے صید افگن یہ بامِ حرم کا طائر ہے
آیا ہے بھٹک کر دیر میں جو گم راہ نہیں ہے زائر ہے
جتنے بھی زمیں پر مجرم ہیں خواہش ہی کے زیرِ فرماں ہیں
ہر جرمِ سیہ کے محضر پر خواہش ہی کی مہریں تاباں ہیں
المختصر ان تشریحوں سے اہم پر یہ حقیقت کھلتی ہے
کہتے ہیں جسے دنیا میں بدی بھٹکی ہوئی وہ اک نیکی ہے

بدلی کا چاند

خورشید وہ دیکھو ڈوب گیا ظلمت کا نشاں لہرانے لگا
مہتاب وہ ہلکے بادل سے چاندی کے ورق برسانے لگا
لو ڈوب گیا پھر بادل میں، بادل ہیں وہ خط سے دوڑ گئے
لو پھر وہ گھٹائیں چاک ہوئیں ظلمت کا قدم تھرّانے لگا
بادل میں چھپا تو کھول دیے بادل میں دریچے ہیرے کے
گردوں پہ جو آیا تو گردوں دریا کی طرح لہرانے لگا
سمٹی جو گھٹا تاریکی میں چاندی کے سفینے لے کے چلا
سکی جو ہوا تو بادل کے گرداب میں غوطے کھانے لگا
غرفوں سے جو جھانکا گردوں کے امواج کی نبضیں تیز ہوئیں
حلقوں میں جو دوڑا بادل کے کہسار کا سر چکرانے لگا
پردہ جو اٹھایا بادل کا دریا پہ تبسم دوڑ گیا
چلمن جو گرائی بدلی کی میدان کا دل گھبرانے لگا
ابھرا تو تجلی دوڑ گئی ڈوبا تو فلک بے نور ہوا
الجھا تو سیاہی دوڑا دی سلجھا تو ضیا برسانے لگا
کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے کیا قید ہے کیا آزادی ہے
انساں کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

گرمی اور دیہاتی بازار

دو پہرہ بازار کا دن گانو کی خلقت کا شور

خون کی پیاسی شعاعیں روح فرسا لو کا زور
آگ کی رَو کاروبارِ زندگی کا پیچ و تاب
تند شعلے، سرخ ذرّے، گرم جھونکے، آفتاب
شور، ہلچل، غلغلہ، ہیجان، لو، گرمی، غبار
بیل، گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ، گُڑ کی بو، مرچوں کی دھانس
خربوزے، آلو، کھلی، گیہوں، کدو، تربوز، گھانس
دھوپ کی شدت، ہوا کی یورشیں، گرمی کی رَو
کملیوں پر سرخ چاول ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جَو
گرم ذرّوں کے شدائد، چھکڑوں کی سختیاں
چھکڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کا دھواں
مرد و زن گردش میں چیلوں کی صدا سنتے ہوئے
چلچلاتی دھوپ کی رَو میں چنے بھنتے ہوئے
میان سے موسم کی تیغِ بے اماں نکلی ہوئی
پیاس سے انسان و حیواں کی زباں نکلی ہوئی
آسماں پر ابر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا رم
نشے میں ممسک کا جیسے وعدۂ جود و کرم
ہر روش پر چڑچڑاپن ہر صدا میں بے رُخی
ہر جگہ پُھکتا ہوا ہر کھوپڑی پکتی ہوئی
سر پہ کافر دھوپ جیسے روح پر عکسِ گناہ
تیز کرنیں جیسے بوڑھے سود خواروں کی نگاہ

کوہستانِ دکن کی عورت

یہ ابلتی عورتیں اس چلچلاتی دھوپ میں
سنگِ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں

واہ کیا کہنا ترا اے حسنِ ارضِ آفتاب
یہ برشتہ رنگ یہ تپتے ہوئے رنگیں شباب

ہر سراپا بت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل
اتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل

چال جیسے تند چشمے تیوریاں جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں بے مثال

عورتیں ہیں یا کہ ہیں برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز پتھریلا شباب

یہ جواں چہرے یہ ان چہروں میں برنائی کا جوش
تو کہے آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش

جسم ہیں کچھ اس قدر ٹھوس الحفیظ و الاماں
لیجیے چٹکی تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں

مچھلیاں شانوں کی ابھری سی بٹی سی کاکلیں
آہن و فولاد کے پٹھے سلاخوں کی رگیں

دید کے قابل ہیں ان کافر بتوں کا رنگ روپ
کھپ چکی ہے جن میں بارش ڈس چکی ہے جن کو دھوپ

ان بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی الاماں

پتھروں کا دودھ پی پی کر ہوئی ہی جو جواں
کنکروں کے فرش پر دُنیا سلاتی ہی جنھیں
آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہی جنھیں
کیا خبر کتنے دلوں کو جوشِ پامالی ہوئی
ان اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہیں پالی ہوئی

ظلمتیں

تیرگی لپٹی ہوئی ہی دہر میں ہر ضو کے ساتھ
عربدہ کرتا ہی یاں ہر راستہ رہرو کے ساتھ
لعلِ شیریں کے تبسم میں ہی غلطاں آہِ سرد
ظلمتوں کی رو بھی ہی قندیلِ رنگی لو کے ساتھ
ہم نفس با این ہمہ برنائی و افسوں گری
بیوگی کا دبدبہ بھی ہی عروسِ نو کے ساتھ
اس قدر بھی ناز فرماتا ہی کوئی اے چمن
دھوپ بھی ہی ابر رنگا رنگ کے پرتو کے ساتھ
انجمن میں رات کو چپکے سے پا جاتا ہی بار
فتنۂ ظلمت نشاں بھی روشنی کی رو کے ساتھ
ڈوب جاتا ہی تڑپ کر سینۂ دریا میں جوش
سوزِ پیچ و تاب بھی تنویرِ ماہِ نو کے ساتھ

پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار
ناداں بیٹھے کشتی پر اور دانا غوطے کھائے
کتّا سوئے گدّے پر اور ٹہلے چوکیدار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار
کووں کو اور راگ سنائے کویل بن کے بیچ
منعم کی اور سیج بسائے مفلس کا دلدار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار
آدم کا بانکا بیٹا اور بھڑوے پن کا روپ
حوّا کی سندر بیٹی اور رنڈی کا بیوپار
پیٹ بڑا بدکار ہے بابا
پیٹ بڑا بدکار

البیلی صبح

نظر جھکائے عروس فطرت جبیں سے زلفیں ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا ہے زلزلے میں افق کی لو تھرتھرا رہی ہے
روش روش نغمۂ طرب ہے چمن چمن جشن رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں کلی کلی گنگنا رہی ہے

ستارۂ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگارِ مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہی
شفق کا پہنے ہوئے گلابی ہر اک سبک پنکھڑی چمن میں
رنگی ہوئی سرخ اوڑھنی کا ہوا میں پلّو سکھا رہی ہی
فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گرد ننھے تارے
کہ جیسے کوئی نئی نویلی جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہی

باغی انسان

حکمراں آج بھی ہی پیرِ مغاں کیا کہنا
وہی دفتر ہی وہی مُہرِ نشاں کیا کہنا

عقل کی تند ہوائیں ہیں خروشاں کب سے
پھر بھی ہی شمعِ جنوں شعلہ فشاں کیا کہنا

کب سے خورشید کی حدّت میں ہی فرمانِ سکوت
پھر بھی جنبش میں ہی ذرّوں کی زباں کیا کہنا

ذرّے ذرّے پہ جہنّم کی لگی ہیں مُہریں
پھر بھی دُنیا پہ ہی جنّت کا گماں کیا کہنا

عقل کے دور میں بھی عشق نہیں ہی خاموش
وہی نالے ہیں وہی شورِ فغاں کیا کہنا

کب سے ہی ذوقِ نظر حکمِ شریعت سے حرام
وہی نظریں ہیں وہی حسنِ جواں کیا کہنا

آج بھی جلوۂ رنگیں کی طلب گاری ہیں
چشمِ انساں ہی ہر سُو نگراں کیا کہنا

ہاں یہ ایں شدتِ آیات و احادیثِ حجاب
دستِ خوباں میں ہی شوخی کی عناں کیا کہنا

شبنم و برف کے اس حلقۂ غمناک میں بھی
اُٹھ رہا ہی دلِ انساں سے دھواں کیا کہنا

ترش ہیں ممبر و محراب کے لہجے کب سے
پھر بھی سرشار ہیں رندانِ جہاں کیا کہنا

کب سے قرنوں کا ہی شانوں پہ اٹھائے ہوئے بار
پھر بھی رقصاں ہی جہانِ گزراں کیا کہنا

سینۂ دہر ہی گو تیرِ حوادث سے فگار
پھر بھی ابرو کی لچکتی ہی کماں کیا کہنا

للہ الحمد کہ خود حکمِ خدا کے باوصف ہو وہی گرمیٔ بازارِ بتاں کیا کہنا

آفریں باد کہ اس جبرِ مشیت پہ بھی ہو
دستِ انساں میں بغاوت کی عناں کیا کہنا

ہماری سوسائٹی

حوصلے سرنگوں ، امیدیں شل آرزو بارِ یاس سے بوجھل
نشہ، بجھتا ہوا سا ایک شرار کیف، گرتی ہوئی سی اک دیوار
ہر لطیفے کی تہ میں رنج و محن ہر ظرافت میں ایک پھیکا پن
شرم سے آپ آپ جھلانی ہر ہنسی ۔ شرمسار ۔ کھسیانی
خال و خط پر دھنواں بناوٹ کا کرب ۔ بالقصد مسکراہٹ کا
چہچہے سرد ، زمزمے مجروح قہقہے تک تھکے ہوئے بے روح
صرف لے دے کے زرق برق لباس ولولے اشک بار، روح اداس
زرد چہرے نقابِ زریں میں سرد لاشیں لباسِ رنگیں میں
نہ تلاطم نہ تازگی نہ ترنگ
یہ ہو اپنی سوسائٹی کا رنگ

جذبی

موت

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جامِ مئے تلخ چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا خود کو سنبھالوں تو چلوں

جانے کب پی تھی ابھی تک ہے مئے غم کا خمار
دھندلا دھندلا نظر آتا ہے جہانِ بیدار
آندھیاں چلتی ہیں دنیا ہوئی جاتی ہے غبار
آنکھ تو مل لوں۔ ذرا ہوش میں آ لوں تو چلوں

وہ مرا سحر، وہ اعجاز کہاں ہے لانا
میری کھوئی ہوئی آواز کہاں ہے لانا
میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں ہے لانا
اک ذرا گیت بھی اس ساز پہ گا لوں تو چلوں

میں تھکا ہارا تھا، اتنے میں جو آئے بادل
کسی متوالے نے چپکے سے بڑھا دی بوتل
اُف وہ رنگین، پراسرار خیالوں کے محل
ایسے دو چار محل اور بنا لوں تو چلوں

مجھ سے کچھ کہنے کو آئی ہے مرے دل کی جلن
کیا کیا میں نے زمانے میں نہیں جس کا چلن
آنسوؤ!! تم نے تو بیکار بھگویا دامن
اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھالوں تو چلوں

میری آنکھوں میں ابھی تک ہے محبّت کا غرور
میرے ہونٹوں کو ابھی تک ہے صداقت کا غرور
میرے ماتھے پہ ابھی تک ہے شرافت کا غرور
ایسے وہموں سے بھی اپنے کو نکالوں تو چلوں

غزل

مشعل تھے جو بحرِ ظلمت میں وہ ماہ و اختر ٹوٹ گئے
اور لطف یہ ہے اے طوفانو! کشتی کے بھی لنگر ٹوٹ گئے

اک یاس بھرے دل پر نہ ہوئی تاثیر تمھاری نظروں کی
اک موم کے بے حس ٹکڑے پر یہ نازک خنجر ٹوٹ گئے

کیا ماتم ان امیدوں کا جو آتے ہی دل میں خاک ہوئیں
کیا روئے فلک ان تاروں پر دم بھر جو چمک کر ٹوٹ گئے

یا اشکوں کا رونا تھا مجھے یا اکثر روتا رہتا ہوں
یا ایک بھی گوہر پاس نہ تھا یا لاکھوں گوہر ٹوٹ گئے

میری ہی نظر کی مستی سے سب شیشہ و ساغر رقصاں تھے
میری ہی نظر کی گرمی سے سب شیشہ و ساغر ٹوٹ گئے

یہ عرشِ محبت ہے میرا اے طائرِ سدرہ ہوش میں آ
اس لاحاصل سی کوشش میں تخئیل کے شہپر ٹوٹ گئے
تو اور غمِ الفت جذبی مجھ کو تو یقین آئے نہ کبھی
جس قلب پہ ٹوٹے ہوں پتھر اس قلب میں نشتر ٹوٹ گئے

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہشِ دنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

ملے غم سے مجھ کو فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرتِ شبانہ
یہی زندگی مصیبت، یہی زندگی مسرت
یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ
کبھی درد کی تمنا، کبھی کوششِ مداوا
کبھی بجلیوں کی خواہش، کبھی فکرِ آشیانہ

محمد علی جوہر

غزل

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو
باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے و لے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لطف جرمِ تمنا سزا کے بعد

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر آن تسلّی ہے ہر لحظہ تشفّی ہے ....
ہر وقت ہے دل جوئی ہر دم ہیں مداراتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر منایا کر
ٹلتی نہیں یوں جوہر اس دیس کی برساتیں

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی — ہوسِ زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
قیدِ گیسو سے بھلا کون رہے گا آزاد — تیری زلفوں کا جو شانوں پہ بکھرنا ہے یہی
اور کس وضع کی جویاں ہیں عروسانِ بہشت — ہیں کفن سرخ شہیدوں کا سنورنا ہے یہی
حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانے — اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی

نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر
کام کرنے کا یہی ہے تمھیں کرنا ہے یہی

دعائے اسیر

(اپنی عزیز بیٹی آمنہ کی علالت پر جس کی اطلاع جیل خانے میں ملی تھی)

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں — تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
امتحاں سخت سہی پر دلِ مومن ہی وہ کیا — جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں
ہے دعا اور دوا فرض ولے حکمِ خدا — ٹل سکے یہ کسی بندے کا بھی مقدور نہیں
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو — نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں
تو تو مُردوں کو جِلا سکتا ہے قرآں میں کیا — تُخرِجُ الحَیَّ مِنَ المَیِّتِ مذکور نہیں
تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم — آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں
یاں بھی ہے یوسف و یعقوب میں زنداں حائل — میں ہوں محصور اگر آپ وہ محصور نہیں

شانِ رحمت مجھے دکھلا کہ ہو تسکیں کا نزول
دلِ جوہر ہے یہ یا رب جبلِ طور نہیں

یہ حالت ہوگئی ہی ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور مے خانہ خالی ہی

ہو رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر یہ اس کی دین ہی جسے پروردگار دے

شہد و شرابِ خلد میں یہ چاشنی کہاں کچھ خونِ دل سے بڑھ کے مزا ہو تو جانیے

آساں نہ تھا تقربِ شیریں تو کیا ہوا تیشے کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور

دینا تھی دادِ تشنہ لبی یوں حسین ؓ کو کوثر کا اک بہانہ بنی کربلاے دوست

پنڈت برج نراین چکبست لکھنوی

رامائن کا ایک سین

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام — راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام — دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال — خاموش ماں کے پاس گیا صورتِ خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال — سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدّتِ ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویرِ سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ — نورِ نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ — لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالتِ دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیرِ یاس کا قفلِ دہن کھلا — افسانۂ شدائدِ رنج و محن کھلا
اک دفترِ مظالمِ چرخِ کہن کھلا — وا تھا دہانِ زخم کہ بابِ سخن کھلا
دردِ دلِ غریب جو صَرفِ بیاں ہوا
خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رک کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں — میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں — لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

گوکھلے

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ — سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ
چھٹے رفاہ کے گل حسنِ انتخاب کے ساتھ — شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ
جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے
رہا مزاج میں سودائے قوم خو ہو کر — وطن کا عشق رہا دل کی آرزو ہو کر
بدن میں جان رہی وقفِ آبرو ہو کر — رگوں میں جوشِ محبت رہا لہو ہو کر
خدا کے حکم سے جب آب و گل بنا تیرا
کسی شہید کی مٹّی سے دل بنا تیرا

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں — اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا
ابھرنے ہی نہیں دیتی یہاں بے مائیگی دل کی — نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا — اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اتر جانا
عروسِ جاں نیا پیراہنِ ہستی بدلتی ہے — فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گزر جانا

سدھاری منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی سے — تنِ خاکی کو شاید روح نے گردِ سفر جانا

زندگی کیا ہی عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہی انھی اجزا کا پریشاں ہونا
دفترِ حسن پہ مُہرِ یدِ قدرت سمجھو — پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا
گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک — ہی اسے طرۂ دستارِ غریباں ہونا

اپنا ہی دم ہوا ہی گلوگیر وقتِ نزع — غیروں کا زندگی میں ہو پھر اعتبار کیا
اب کی تو شامِ غم کی سیاہی کچھ اور ہی — منظور ہی تجھے مرے پروردگار کیا
دنیا سے لے چلا ہی جو تو حسرتوں کا بوجھ — کافی نہیں ہی سر پہ گناہوں کا بار کیا
جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح — اس کے لیے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے — ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے

رہے گی آب و ہوا میں خیال کی بجلی — یہ مشتِ خاک ہی فانی رہے نہ رہے

کفر ہی اس کی شکایت جس نے دل پیدا کیا — دل سے جو پیدا ہوئی وہ آرزو بدنام ہی

یہ کیسی بزم ہی کیسے ساقی ہیں — شراب ہاتھ میں ہی اور پلا نہیں سکتے

نیا بسمل ہوں میں واقف نہیں رسمِ شہادت سے — بتلا دے تو ہی ای ظالم تڑپنے کی ادا کیا ہی

حسرت موہانی

غزل

تاثیرِ برقِ حسن جو ان کے سخن میں تھی
اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

اک رنگِ التفات بھی اس بے رخی میں تھا
اک سادگی بھی اس نگہِ سحر فن میں تھی

محتاج بوئے عطر نہ تھا جسمِ خوب یار
خوشبوئے دل بری تھی جو اس پیرہن میں تھی

معلوم ہو گئی مرے دل کو زراہِ شوق
وہ بات پیار کی جو ہنوز اس دہن میں تھی

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی
جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی

اچھا ہوا کہ خاطرِ حسرت سے مٹ گئی
ہیبت سی اک جو خطرۂ دار و رسن میں تھی

غزل

خوب رویوں سے یاریاں نہ گئیں
دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں

عقل صبر آشنا سے کچھ نہ ہوا
شوق کی بے قراریاں نہ گئیں

تھے جو ہم رنگِ ناز ان کے ستم
دل کی امیدواریاں نہ گئیں

مے و مینا سے یاریاں نہ گئیں
میری پرہیزگاریاں نہ گئیں

اشک باری سے سوزِ دل نہ مٹا
آہ کی شعلہ باریاں نہ گئیں

حسن کی دل فریبیاں نہ گئیں
عشق کی تازہ کاریاں نہ گئیں

جامہ زیبی نہ پوچھیے ان کی — جو بگڑنے میں بھی سنور جائیں
شب وہی شب ہے دن وہی دن ہیں — جو تری یاد میں گزر جائیں
گریۂ شام سے تو کچھ نہ ہوا — ان تک اب نالۂ سحر جائیں

شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

نجاتِ ہند

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہو تجھ کو آرزو
ہمتِ سربلند سے یاس کا انسداد کر
قول کو زید و عمر کے حد سے سوا اہم نہ جان
روشنیٔ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر
حق سے بہ عذرِ مصلحت وقت پہ جو کرے گریز
اس کو نہ پیشوا سمجھ اس پہ نہ اعتماد کر
خدمتِ اہلِ جور کو کر نہ قبول زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر
غیر کی جد و جہد پہ تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی شیدائی نہ تھا — باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا
عشقِ روز افزوں پہ اپنے مجھ کو حیرانی نہ تھی — جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو نازِ یکتائی نہ تھا

دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی — جب کہ تیرا حسن سرگرمِ خود آرائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق — ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا

تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
ورنہ پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے
یاد ہیں وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں
التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

زمانِ فصلِ گل آیا نسیمِ خوش گوار آئی — دلوں کو مژدہ ہو پھر جوشِ مستی کی بہار آئی
پھلا پھولا رہے گلزار یارب حسنِ خوباں کا — مجھے اس باغ کے ہر پھول سے خوشبوئے یار آئی
یہ کیا اندھیر ہے اے دشمنِ اہلِ وفا تجھ سے — ہوس نے کامِ جاں پایا محبت شرمسار آئی
الٰہی رنگ یہ کب تک رہے گا ہجرِ جاناں میں — کہ روز بے دلی گزرا تو شامِ انتظار آئی
سرِ پُر شور بھی اک بار تھا جس کو مری گردن — ترے کوچے میں کل او فتنۂ دوراں اتار آئی
جو اُن کے حسن سے بھی بڑھ گئی ہے بے قراری میں — تڑپ ایسی کہاں سے عشق میں پروردگار آئی
تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے — تماشا کام یاب آیا تمنا بے قرار آئی

نہ آیا ہاتھ جز رنج و بلا کچھ عشق حسرت کو
دیارِ حسن کی آب و ہوا ناسازگار آئی

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد — ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کی چشمِ کرشمہ ساز کرے

تصور میں بھی اُن کے کچھ عجب عالم نکلتا ہے — اسی پر تو مری حیرانیوں کا دم نکلتا ہے
وہ ظاہر میں عبث دل دادۂ بیگانہ خوئی ہیں — کہیں دل سے خیالِ الفتِ باہم نکلتا ہے

بکھرے رخِ روشن پہ جو ہیں گیسوئے شب رنگ
نکلا ہے ترے حسنِ خود آرا کا غضب رنگ
کیا کیجیے بیاں اس تنِ نازک کی حقیقت
خوش بو میں ہے گل بو تو لطافت میں ہے سب رنگ

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام — دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام
اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود — رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
نشو و نمائے سبزۂ و گل ہے بہار میں — شادابیوں نے گھیر لیا ہے چمن تمام
اس نازنیں نے جب سے کیا ہے وہاں قیام
گل زار بن گئی ہے زمینِ دکن تمام

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے مٹا کرتی ہیں تقدیریں کہیں
التفاتِ یار تھا اک خواب آغاز وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بیدلیٔ ہمرہاں سے ہم

کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزلِ مراد
لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم

ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق
پھر آ گئے وہیں پہ چلے تھے جہاں سے ہم

مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حالِ دل — پھر تو نے یاد آ کے بدستور کر دیا

ایک ہی بار ہوئیں وجہِ گرفتاریِ دل — التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

رات پیرِ مغاں کی محفل سے — جو اٹھا مست اٹھا خراب اٹھا

اس درجہ دل پذیر ہے آہنگِ نغمہ کیوں — پنہاں لباسِ درد میں تیری صدا ہے کیا

مدتیں ترکِ محبت کو ہوئیں پھر بھی عجب — یادِ یار آتی ہے کیوں بے اختیار اب کی برس

آہ وہ یاد کہ جس یاد کو ہو کر مجبور — دلِ مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے

لایا ہے دل پر کتنی خرابی — اے یار تیرا حسن شرابی
پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں — یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

عشاق کے دل نازک اس شوخ کی خو نازک
نازک اسی نسبت سے ہے کارِ محبت بھی

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

اُف اس نگاہِ شوق کی مستی جو بے خبر
خوبی پہ روئے یار کی پہلے پہل گئی

آپ کا شوق بھی تو اب دل میں
آپ کی یاد کے سوا نہ رہا

رو برو اس کے کچھ نہیں معلوم
کیا ہوا بے خودی میں کیا نہ ہوا
لطفِ ساقی تھا بیدریغ مگر
مجھ بلا نوش کا بھلا نہ ہوا

ہے ہجر بھی وصال زہے خوبیٔ وصال
بیٹھے ہیں انجمن میں تری انجمن سے دور
رعنائیٔ خیال کو ٹھہرا دیا گناہ
زاہد بھی کس قدر ہے مذاقِ سخن سے دور

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

کچھ یونہیں اپنے حسن پہ مغرور تھا وہ شوخ
کچھ لے اڑی ہے اور بھی اس کو ہوائے ناز

مستی کے پھر آ گئے زمانے
آباد ہوئے شراب خانے
کر دوں گا ہر ولی کو مے خوار
توفیق جو دی مجھے خدا نے

دیکھتا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرتا   شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرتا

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہنچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب

رائگاں حسرتؔ نہ جائے گا مرا مشتِ غبار
کچھ زمیں لے جائے گی کچھ آسماں لے جائے گا

دکھنو یہ نہیں گزر جائے نہ تاریکیٔ ابر   جام کو بادۂ پُر نور سے لبریز کرو

اب اُن آنکھوں میں ہے صبحِ شبِ وصل   نہ شوخی کی نہ گنجایش حیا کی

حفیظ جالندھری

"انگلستان میں ہندستانیوں سے خطاب"

(۱)

اپنے وطن میں
سب کچھ ہی پیارے
رشکِ عدن ہو — باغِ وطن بھی
گل بھی ہیں موجود — گل پیرہن بھی
نازک بدن بھی — غنچہ دہن بھی
لیلیٰ روش بھی — شیریں سخن بھی
کچھ کم نہیں وہ
اجڑا چمن بھی
اس کے بھی اک بار — کر لے نظارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہی پیارے

(۲)

اپنے وطن میں
سب کچھ ہی پیارے
اس حسن میں ہو — ہلکا نمک بھی

مہ کا نشہ بھی لطفِ گزک بھی
رنگین کلیاں جن میں مہک بھی
دل میں وفا بھی درد اور تپک بھی

روئے زمیں بھی
چشمِ فلک بھی

سب ہیں بھکاری بھارت کے دوارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

(۳)

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

حسن و نظر کی خاموش گھاتیں
عشق و ہوس کی دھومیں براتیں
سب ہیں ٹھاں بھی بیدار راتیں
دیکھی نہیں کیا تو نے وہ راتیں

دولہا دلہن جب
کرتے ہیں باتیں

کھلتی ہیں کلیاں ہنستے ہیں تارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

(۴)

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

مے خانے بھی ہیں — پیرِ مغاں بھی
ہنگامے بھی ہیں — خاموشیاں بھی
لطفِ بہاراں — خوفِ خزاں بھی
ساگر بھی موجود — آبِ رواں بھی

جو کچھ یہاں ہے
سب ہے وہاں بھی
پھرتے ہو بے کار — کیوں مارے مارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

(۵)

سودے وہاں بھی — کرتے ہیں شہری
چلتے ہیں ہر سو — سکّے سنہری
دیہات پہ ہے — گو نیند گہری
لہریں وہاں بھی — لیتے ہیں لہری

بازار منڈی
تھانہ کچہری
کرتے ہیں دن رات — سب وارے نیارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

(۶)

اپنے وطن کے دن رات نیارے
وہ چاند سورج نوری غبارے
وہ ندیاں ہیں امرت کے دھارے
دُنیا سے اونچے پربت ہمارے
باغ اور آکاش
پھول اور تارے
سب منتظر ہیں میرے تمہارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

(۷)

وہ سیدھی سادھی بچوں کی مائیں
آنچل ہیں جن کے ٹھنڈی ہوائیں
زلفیں ہیں جن کی کالی گھٹائیں
بھولو گے کب تک ان کی وفائیں
کب تک کرو گے
ان پر جفائیں
چھوڑا ہے ان کو کس کے سہارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

(۸)

معصوم معصوم بھولی نگاہیں
دل ڈھونڈتا ہے جن کی پناہیں
کن حسرتوں سے تکتی ہیں راہیں
وہ گرم آنسو وہ سرد آہیں
مانیں نہ مانیں
چاہیں نہ چاہیں
کھینچیں گے اک دن ان کے اشارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

(۹)

گردن جھکاؤ تصویر دیکھو
میسور دیکھو کشمیر دیکھو
خواب جناں کی تعبیر دیکھو
پھر تاج کی بھی تعمیر دیکھو
آنکھوں سے اپنی
تقصیر دیکھو
اپنے خزانے تم نے بسارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

(۱۰)

سب کچھ ہے پیارے اپنے وطن میں

ہے مست زردار   مال اور دھن میں
مزدور گویا   مردہ کفن میں
لیکن ہے وہ بھی   اپنی لگن میں

پھر گونجتی ہے
گوکل کے بن میں

لے بنسری کی   جمنا کنارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

ماضی سے بہتر   گرچہ نہیں حال
علم و ہنر کا   پھر بھی نہیں کال
ٹیگور کا ساز   جادوئے بنگال
پنجاب کا ناز   اعجازِ اقبال

اور یہ مسافر
آوارہ پامال

ہیں قابلِ دید   سارے کے سارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

پریت کا گیت

اپنے من میں پریت

بسا لے
اپنے من میں پریت

من مندر میں پریت بسا لے   چھوڑ دے مسجد اور شوالے
دل کی دُنیا کر لے روشن   اپنے گھر میں جوت جگا لے
پریت ہی تیری پریت پرانی   بھول گیا او بھارت والے
بھول گیا او بھارت والے
پریت ہی تیری ریت
بسا لے
اپنے من میں پریت

کرودھ کپٹ کا اترا ڈیرا   چھایا چاروں کھونٹ اندھیرا
شیخ برہمن دونوں رہزن   ایک سے بڑھ کر ایک لٹیرا
ظاہر داروں کی سنگت میں   کوئی نہیں ہے سنگی تیرا
کوئی نہیں ہے سنگی تیرا
من ہی تیرا میت
بسا لے
اپنے من میں پریت

نفرت اک آزار ہے پیارے   دکھ کا دارو پیار ہے پیارے
آجا اصلی روپ میں آجا   تو ہی پریم اوتار ہے پیارے
یہ ہارا تو سب کچھ ہارا   من کے ہارے ہار ہے پیارے

من کے ہارے ہار ہی پیارے
من کے جیتے جیت
بسا لے
اپنے من میں پریت
دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے مرجائے پر میت نہ جائے
میں ڈرتا ہوں کوئی تیری جیتی بازی جیت نہ جائے
جو کرنا ہے جلدی کر لے تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے
تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے
وقت نہ جائے بیت
بسا لے
اپنے من میں پریت

جاگ سوزِ عشق

جاگ سوزِ عشق جاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ کام دیوتا فتنہ ہائے نو جگا
بجھ گیا ہے دل مرا پھر کوئی لگن لگا
سرد ہو گئی ہے آگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

پڑگئی دلوں میں پھوٹ کیا بجوگ پڑ گیا
پرتھوی پہ چار کھونٹ ایک سوگ پڑ گیا
سرنگوں ہو شبھشی ناگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ
تو نے آنکھ بند کی کائنات سو گئی
جاگ سوزِ عشق جاگ

تو نے آنکھ بند کی کائنات سو گئی
حسن خود پسند کی دن سے رات ہو گئی
زرد پڑ گیا سہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

اب نہ وہ سفر نہ سیر رہبری نہ رہزنی
کچھ نہیں ترے بغیر دوستی نہ دشمنی
اب لگاؤ ہی نہ لاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

تو جو چشم وا کرے ہر امنگ جاگ اٹھے
آہ و نالہ جاگ اٹھے راگ رنگ جاگ اٹھے
جوگ سے ملے بہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

فرشتے کا گیت

دیکھو اس دُنیا کا نظارہ

میرے ساز کے تاروں میں   رنگیں نغمہ زاروں میں

نیندوں کے دریاؤں میں ہو ایک جاپانی دُنیا   اس دُنیا کو دُنیا کہہ دیتی ہو خوابی دُنیا

دیکھو اس دنیا کا نظارہ

ہلکا ہلکا پیارا پیارا

میرے ساز کے تاروں میں   رنگیں نغمہ زاروں میں

ہستی کیا ہو میٹھا سپنا

سپنا کیا ہو میٹھی پریت   میٹھی پریت ہو میرا گیت

میرے میٹھے گیتوں میں بستی ہو ساری ہستی   میٹھے میٹھے گیت ہیں میرے پیاری پیاری ہستی

ہستی کیا ہو میٹھا سپنا

دل میں رہنا آنکھ سے چھپنا

سپنا کیا ہو میٹھی پریت   میٹھی پریت ہو میرا گیت

ریاض خیرآبادی

اُتری ہے آسمان سے جو کل اُٹھا تو لا ... طاقِ حرم سے شیخ وہ بوتل اٹھا تو لا
دھونا ہے داغ جامۂ احرام صبح صبح ... حجرے سے شیخ پانی کی بوتل اٹھا تو لا
مجھ کو بھی انتظار تھا ابر آئے تو یوں ... ساقی اگر یہ سچ ہے کہ بادل اٹھا تو لا
طاقِ حرم میں شیخ گلابی ہے پھول سی ... اس کام کا ملے گا تجھے پھل اٹھا تو لا
میں کام لوں گا ابر کا اے رند تان کر ... تو مجھ فقیر مست کا کمبل اٹھا تو لا

ناصح کا منہ ہو بند چکھا دوں شراب خلد
ساقی ذرا ریاضؔ کی بوتل اٹھا تو لا

کچھ آئینے نے اور ہی عالم دکھا دیا ... دونوں کو ایک دوسرے نے کیا بنا دیا
دیوانگی نے میری مجھے کیا مزا دیا ... ان کو بھی ساتھ میرے تماشا بنا دیا
ننھے سے دل کی چھوٹی سی تربت بنائی تھی ... نقشِ قدم نہ تھا جسے تم نے مٹا دیا
کیسے یہ بادہ خوار ہیں سن سن کے پی گئے ... واعظ کو کچھ مزا نہ کسی نے چکھا دیا
شوخی سے ہر شگوفے کے ٹکڑے اڑا دیے ... جس غنچے پر نگاہ پڑی دل بنا دیا
اس واسطے کہ آؤ بھگت مے کدے میں ہو ... پوچھا جو گھر کسی نے تو کعبہ بنا دیا
ہم گزرے جس طرف سے ادھر انگلیاں اٹھیں ... دیوانہ ان حسینوں نے ہم کو بنا دیا

پاؤں تو ان حسینوں کا منہ چوم لوں ریاضؔ
آج ان کی گالیوں نے بہت ہی مزا دیا

ڈھل چکی ہے اب جوانی جائے گی
یہ شرابِ ارغوانی جائے گی

بعدِ توبہ آتشِ سیّال خُم
میرے گھر سے ہو کے پانی جائے گی

تیغ ہی کیا ہاتھ میں قاتل کے تھی
اے حنا تو بھی تو ہاتھانی جائے گی

شوخیاں کہتی ہیں کُھل کھیلیں گے وہ
اب حیا کی پاسبانی جائے گی

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی
مے کدے سے اب پرانی جائے گی

پینے آئیں تو فرشتہ خورِ ریاضؔ
حور کے دامن میں چھانی جائے گی

جو ہم آئے تو بوتل کیوں الگ پیرِ مغاں رکھ دی
پرانی دوستی بھی طاق پر اے مہرباں رکھ دی

خدا کے ہاتھ ہے بکنا نہ بکنا مے کا اے ساقی
برابر مسجدِ جامع کے ہم نے اپنی دکاں رکھ دی

چمن کا لطف آتا ہے مجھے صیاد کے صدقے
قفس میں لا کے اس نے آج شاخِ آشیاں رکھ دی

بنا ہے ایک ہی دونوں کی کعبہ ہو کے بت خانہ
اٹھا کر خشتِ خُم ہم نے وہاں رکھ دی یہاں رکھ دی

یہ قیس و کوہکن کے سے فسانے بن گئے کتنے
کسی نے ٹکڑے کر کے سب ہماری داستاں رکھ دی

یہ عالم ہے ریاضؔ ایک ایک قطرے کو ترستا ہوں
حرم میں اب خدا جانے بھری بوتل کہاں رکھ دی

زمینِ مے کدہ عرشِ بریں معلوم ہوتی ہے — یہ خشتِ خم فرشتے کی جبیں معلوم ہوتی ہے
شفق کہہ لے کوئی چاہے شفق گوں آسماں کہہ لے — ہمیں تو کوئے قاتل کی جبیں معلوم ہوتی ہے
اے ساقی ذرا میری شرابِ تلخ تو لانا — مئے کوثر تو بالکل انگبیں معلوم ہوتی ہے
یہ اے صیاد رہ رہ کر چمکتی ہے کہاں بجلی — جہاں میرا نشیمن تھا وہیں معلوم ہوتی ہے

ریاضؔ ایسی مرے دل سے لگی ہے جامِ کوثر کی
مئے انگور اب اچھی نہیں معلوم ہوتی ہے

ہمارے دل میں ہے جو داغ ایسا کم نکلتا ہے — یہ بن بن کر چراغِ محفلِ ماتم نکلتا ہے
ترے ٹھوکر کے فتنے کو نہ ایسا ہم سمجھتے تھے — یہ ظالم تو قیامت سے قدِ آدم نکلتا ہے
بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خم رکھ دیں — جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے
مرے آنے سے کیوں دھومیں مچی ہیں بزمِ ساقی میں — یہ کیا ہے بعد مدت کیوں یہ جامِ جم نکلتا ہے
تمھیں کیوں کر بتا دوں کیا مرے دل پر گزرتی ہے — تمھیں کیوں کر دکھاؤں تم میں کیا عالم نکلتا ہے
یہاں رونا پڑا دو دو کا ہے آئیں نہ ایسے میں — سسکتی ہے تمنا آرزو کا دم نکلتا ہے
سحر ہوتے وہ اپنا چاکِ دامن لے کے بیٹھے ہیں — رفو کرنے کو تارِ دامنِ مریم نکلتا ہے

ریاضؔ ایسا گیا گزرا نہیں جو شان جانے دے
گدائی کے لیے وہ لے کے جامِ جم نکلتا ہے

روزہ رکھ کر بلا کے دن کاٹے ہیں — مے سے دامن بچا کے دن کاٹے ہیں
مے خانے میں ہم تشنہ لبوں نے ساقی — سینے سے سبو لگا کے دن کاٹے ہیں

روشن صدیقی

ساقی

دیکھ وہ عرش سے نازل ہوئی شام ای ساقی
ہے اب اک لمحہ بھی تاخیر حرام ای ساقی
زندگی ہی شب تاریک نہ ہو جائے کہیں
لا! مہ و مہر سے ترشا ہوا جام ای ساقی
تیری صہبا، خم و مینا و سبو، توڑ گئی
کہ یہ شمشیر تھی بیزارِ نیام ای ساقی
اب تری نرگسِ مخمور کا ایما کیا ہے
آج تو بزم میں ہے لغزشِ عام ای ساقی

اب وہ مے دے کہ جو ہو نکہت افروزِ خودی
سخت برہم ہے زمانے کا نظام ای ساقی
جس نے صدیوں سے نہ دیکھا تھا کبھی روئے غروب
اب وہ خورشیدِ خرد ہے لبِ بام ای ساقی
علمِ موجود کے ایوان کا اب حال یہ ہے
جیسے طوفاں میں کوئی کشتیٔ خام ای ساقی
ٹھوکروں میں سرِ پندارِ خرد ہے پامال
رخشِ تخریب ہے آزادِ زمام ای ساقی

جس نے کاشانۂ انساں کو کیا تھا ویراں
اب وہ تہذیب ہے ویرانِ دوام اے ساقی
جس نے صہبائے محبت کو کیا زہر آلود
آج اس زہر سے ہے مرگ بجام اے ساقی
جو غمِ عشق کی عظمت کو سمجھتا تھا حرام
اس پہ ہر لمحۂ راحت ہے حرام اے ساقی
ماجرا ذلتِ تزویرِ تمدن کا نہ پوچھ
جیسے رسوا کوئی تا ظورۂ بام اے ساقی

آگ اور خون کے طوفاں ہیں برافگندہ نقاب
آج بے پردہ ہے دوزخ کا مقام اے ساقی
خود کہے دیتی ہے خاکسترِ تہذیبِ فرنگ
کون تھا سوختۂ آتشِ خام اے ساقی
گر یہ ہے ہوس پرستی کی سزا کا آغاز
کیا ہو اب دیکھیے پاداشِ تمام اے ساقی
علم کہتا ہے جسے قاصدِ اقلیمِ فنا
زلف بردوش ہے وہ ظلمتِ عام اے ساقی

اب ترے در پہ زمانہ طلب گارِ سکوں
کہ یہی در تو ہے محبوبِ انام اے ساقی
یہیں ملتی ہے محبت کی ہواؤں کو حیات
لمحہ لمحہ ہے یہاں خلدِ مشام اے ساقی

داغِ غم تیرے سوا کون مٹا سکتا ہے
مہرِ تاباں نہ کوئی ماہِ تمام اے ساقی
تیرے مے خانے سے اٹھتی ہوئی ایک ایک کرن
ہے سکونِ دلِ انساں کا پیام اے ساقی

عام ہے اسود و احمر پہ ترا جود و کرم
سب کی دولت ہے تری رحمتِ عام اے ساقی
کچھ یہاں مشرق و مغرب کی نہیں ہے تخصیص
سب کو ملتا ہے ترے ہاتھ سے جام اے ساقی
تو نے علم و عمل و عشق کو بخشا وہ سرور
کہ جو ہے عرش پہ مصروفِ خرام اے ساقی
جس سے ہستی بھی ہے سرشار فنا بھی مدہوش
تیری صہبا میں ہے وہ کیفِ تمام اے ساقی

روشنی

دیکھ کر دیدۂ گیتی میں فروغِ اُمید
مطمئن ہوں کہ بہت جلد وہ دور آئے گا

جسے گردوں نے ستاروں میں چھپا رکھا ہے
کہکشاں نے جسے اک راز بتا رکھا ہے
قدسیوں نے جسے انساں سے چھپا رکھا ہے

ختم ہونے کو ہے افسانۂ محرومیِ دید
اب یہ پردہ رخِ امکاں سے سرک جائے گا

ہاں وہی دور وہی عہدِ مسرت بنیاد
جس کو روحِ غمِ پنہاں نے کیا ہے تعمیر

وہی عالم وہی مسجودِ جبینِ ایام
وہی آغاز کہ جس کا نہیں کوئی انجام
وہی جنت وہی کیفِ ابدی کا پیغام

چشمِ آدم میں جو تھا صبحِ ازل سے آباد
مسکراتا ہے وہی خواب بہ شکلِ تعبیر

یہ سکوں اور یہ شب ہائے غلامی کا فسوں
زورِ طوفانِ تغیر سے بکھر جائے گا

وقت توڑے گا روایات کے بت خانوں کو
غرق کر دے گا کمالات کے ایوانوں کو
پھونک دے گا درِ ظلمت کے نگہبانوں کو

ہے یہ مژدہ کہ پسِ معرکۂ آتش و خوں
چہرۂ عالمِ ایجاد نکھر جائے گا

جس تصور پہ غلامانِ خرد تھے مغرور
وہ جہاں سوز تصور ہے چراغِ سحری

اب گریبانِ تمدن میں رفو نا ممکن
تنِ بے روح میں تجدیدِ نمو نا ممکن
رنگ لائے نہ صداقت کا لہو نا ممکن

جلوہ گر لوحِ تغیر پہ ہی یہ آیتِ نور
کہ گرا چاہتا ہی خیمۂ بیدادگری

خوش ہو ای دوست کہ وہ دورِ بہار آتا ہی
جس کو نزدیکِ خزاں کر نہ سکے گا انساں

شکل نفرت نہ جہاں میں نظر آئے گی کبھی
موجِ بیگانہ وحشی سر نہ اٹھائے گی کبھی
غیرت آ کے یہیں منہ نہ دکھائے گی کبھی

اب زمیں پر درِ یزداں سے وہ پیار آتا ہی
کہ جسے نذرِ زباں کر نہ سکے گا انساں

ن۔ م۔ راشد

بے کراں رات کے سنّاٹے میں

تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بے کراں رات کے سناٹے میں
جذبۂ شوق سے ہو جاتے ہیں اعضا مدہوش
اور لذت کی گرانباری سے
ذہن بن جاتا ہے دلدل کسی ویرانے کی
اور کہیں اس کے قریب
نیند آغازِ زمستاں کے پرندے کی طرح
خوف دل میں کسی موہوم شکاری کا لیے
اپنے پر تولتی ہے چیختی ہے
بے کراں رات کے سناٹے میں
تیرے بستر پہ مری جان کبھی
آرزوئیں ترے سینے کے کہستانوں میں
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں

ایک لمحے کے لیے دل میں خیال آتا ہے
تو مری جاں نہیں .....

بلکہ ساحل کے کسی شہر کی دوشیزہ ہو
اور ترے ملک کے دشمن کا سپاہی ہوں میں
ایک مدت سے جسے ایسی کوئی شب نہ ملی
کہ ذرا روح کو اپنی وہ سبک بار کرے
بے پناہ عیش کے ہیجان کا ارماں لے کر
اپنے دستے سے کئی روز سے مفرور ہوں میں
تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بے کراں رات کے سناٹے میں

شرابی

آج پھر جی بھر کے پی آیا ہوں
دیکھتے ہی تیری آنکھیں شعلہ ساماں ہو گئیں
شکر کر اے جان کہ میں
ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام
صدر اعظم یعنی دریوزہ گر اعظم نہیں
ورنہ اک جام شرابِ ارغواں
کیا بجھا سکتا تھا میرے سینۂ سوزاں کی آگ
غم سے مر جاتی نہ تو
آج پی آتا جو میں
جام رنگیں کے بجائے

بے کسوں اور ناتوانوں کا لہو
شکر کر اے جان کہ میں
ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام
اور بہتر عیش کے قابل نہیں

زنجیر

گوشۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش ہویدا ہو چلی
سنگِ خارا ہی سہی خارِ مغیلاں ہی سہی
دشمنِ جاں دشمنِ جاں ہی سہی
دوست سے دست و گریباں ہی سہی
یہ بھی تو شبنم نہیں
یہ بھی تو مخمل نہیں، دیبا نہیں، ریشم نہیں

ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں
اک نیا ارماں نئی امید پیدا ہو چلی
حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکل
وہ حسیں اور دور افتادہ فرنگی عورتیں
تو نے جن کے حسنِ روز افزوں کی زینت کے لیے
سالہا بے دست و پا ہو کر بُنے ہیں تار ہائے سیم و زر
اُن کے پردوں کے لیے بھی آج اک سنگین جال

ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال

شکر ہو دنبالۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوہساروں، ریگ زاروں سے ندا آنے لگی
ظلم پروردہ غلاموں بھاگ جاؤ
پردۂ شب گیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ہنگامۂ بار آورد کو
حیلۂ شب خوں بناؤ

ز۔خ۔ش

سپاس نامۂ اُردو

(بہ حضورِ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع خسروِ دکن)

میں شانہ سے درگزری آئینے سے باز آئی
اب دل ہی نہیں جس میں ہو ذوقِ خود آرائی

ہر چند کہ صورت میں ہوں نور کی مورت میں
ناظر نہ ہو جب کوئی کس کام کی رعنائی

اک چاند ہوں بدلی میں اک لعل ہوں گدڑی میں
اک حسن ہوں دیہاتی اک پھول ہوں صحرائی

ہوں بزمِ حریفاں میں جوں آئینہ حیراں میں
با ایں ہمہ زیبائی، با ایں ہمہ رعنائی

اس دھن میں کہ ہاتھ آئے دامن کسی کامل کا
اس دھن میں کہ ہو جائے شاید کہیں شنوائی

ہر سمت میں زباں ہو کر میں چلتی رہی برسوں
کل ہند کی وسعت میں کی بادیہ پیمائی

آخر درِ محسن تک قسمت مجھے لے آئی
ہاں مجھ کو بشارت ہو اے ذوقِ جبیں سائی

جاں از سرِ نو بخشی میرے تنِ مردہ میں
پھر زندہ کیا اس نے اعجازِ مسیحائی

قاصد ہوں اک اردو کی از شاہ نہیں مجھ کو
دعوائے زباں دانی، مشقِ سخن آرائی

تحفۂ درویش

بحرِ غم میں ہے سخت طغیانی
سر سے اونچا گزر گیا پانی

کب تک ای نزہتِ برشتہ جگر — شورِ "یارب" سے عرش جنبانی
رونے دھونے سے جان کھونے سے — کہیں بنتے ہیں کام دیوانی
دردِ دل دردآفریں کو سنا — کرگزر جی میں ہی جو کچھ ٹھانی
دشتِ وحدت ہی دشتِ وحدت ہی — دیکھ آہستہ کر فرس رانی
بے خبر پہلے نقش کر دل پر — عظمتِ بارگاہِ یزدانی
مایۂ اشک یاں بضاعتِ مور — ہیچ واں شوکتِ سلیمانی
پہلے دے صدقہ ماسوی اللہ کا — پہلے کر جان و دل کی قربانی
چاہیے بہرِ نذرِ جنسِ گراں — چاہیے خوں کو بسّدافشانی
صدفِ فکر سے نکال گہر — تربتر کر عرق سے پیشانی
نزہتِ بے نوا سے ہدیہ بدست — ہو قبولِ جنابِ سلطانی
ہدیہ کیا۔ ایک سادہ دفتر پر — لکھ کے لائی ہوں لفظ "لاثانی"

دین ہی الفتِ وطن نغانستاں
عرفِ مجنوں ہی پیشۂ حسّانی

وحید الدین سلیم

آریوں کی پہلی آمد ہندستان میں

(۱)

وہ دیکھو، کہ موجیں رقص کناں ہیں سطح زمین پر گنگا کی
نو وارد آریہ حیرت میں ہیں دیکھ کے شان اس دریا کی
گنگوتری سے آتی ہے چلی، اٹھکھیلیاں کرتی دھار اس کی
آزادی ہے تیور سے عیاں، متوالی ہے رفتار اس کی

(۲)

اُتر کی طرف جب اٹھتی ہے، اس قافلۂ مغرب کی نظر
پڑتی ہوئی کرنیں سورج کی، ہیں دیکھتے برف کے تودوں پر
ہر قلۂ کوہ ہمالیہ پر، عظمت کے ہیں بادل چھائے ہوئے
سینوں کو ہیں تانے دیو کھڑے، امبر سے سروں کو ملائے ہوئے

(۳)

برگد کے درختوں سے جنگل، پھیلے ہیں پہاڑ کے دامن میں
شاخیں ہیں جو اُن کی سایہ فگن، ظلمت کا سماں ہے ہر بن میں
پھرتے ہیں وہ فیلِ مست یہاں، ہیں دیو کا جن کے قد پہ گماں
یہ کالی گھٹا جب دوڑتی ہے، آتا ہے نظر ہیبت کا سماں

(۴)

ہیں رنگ برنگ کے پھول کھلے، زینت ہے چمن کی شباب اُن کا
کھولا ہے نسیم سحر نے ابھی، کس شان سے بند نقاب اُن کا
آئے ہیں مسافر ہند میں جو خیبر کے دروں سے اُتر کے ابھی
دیکھے۔ جیسے انھوں نے لالہ و گل پامیر کی وادی میں نہ کبھی

(۵)

طائر بھی یہاں پیدا ہیں کیے قدرت نے عجب گل رنگ و حسیں
گر زمزمے اُن کے رشی سُن لیں، یاد آئے انھیں فردوس بریں
اندر کے اکھاڑے کی پریاں، گاتی ہیں جو دل کش راگنیاں
یہ لوچ سُروں میں اُن کے نہیں، یہ سوز گلوں میں اُن کے کہاں

(۶)

سورج کی چمکتی ہوئی کرنیں، ہیں چھیڑتی ٹھنڈی ہواؤں کو
بھر دیتی ہیں نور و حرارت سے، باغوں کو اور ان کی فضاؤں کو
سوتی ہوئی سوتیں چشموں کی، اٹھتی ہیں سب آنکھیں مل مل کر
دھاریں ہیں جو برف کے پانی کی، آتی ہیں پہاڑوں سے چل کر

(۷)

اے آریو، آؤ قدم رکھو، ان حسن بھرے گلزاروں میں
جنّت کے مزے لوٹو گے سدا، اس پاک زمیں کی بہاروں میں
گنگ و جمن کے کناروں پر، شہر اپنے نئے آباد کرو
گنگا کے بھجن کر کر کے ہون، ہو جاؤ مگن دل شاد کرو

حُسن کی زبان سے

جہاں میں ہے ضیا مری ، میں حُسنِ جلوہ کار ہوں
میں رونق اس چمن کی ہوں ، میں فصلِ نوبہار ہوں
میں زیبِ کائنات ہوں ، میں فخرِ روزگار ہوں
میں شاہدِ نہفتہ کا جمالِ آشکار ہوں
کہ آئینے میں دہر کے ، میں عکسِ کردگار ہوں

(۲)

کلیم کو نہ اپنا رُخ میں بے خطر دکھا سکا
سُراغ میرے نور کا نہ کوہِ طور پا سکا
نہ میں نظر میں آسکا ، نہ عقل میں سما سکا
خیال میرے اوج پر ، نہ پر لگا کے جا سکا
میں حصنِ بے شکست ہوں ، میں راہِ ناگزار ہوں

(۳)

پڑی ہے اک خفیف سی ، نجوم پر کرن مری
کہ رکھتی ہے طواف میں ، سدا انھیں لگن مری
چھپی حجابِ قدس میں ہے شمعِ انجمن مری
ستارے جل کے خاک ہوں ، جو دیکھ لیں پھبن مری
میں گنجِ آب و تاب ہوں ، میں بحرِ نور و نار ہوں

(۴)

یہ چاندنی کی ٹھنڈکیں ، یہ دھوپ کی حرارتیں

یہ صبح کی صباحتیں ، یہ شام کی ملاحتیں
زمین کی یہ زینتیں ، فلک کی یہ لطافتیں
یہ بجلیوں کی شوخیاں ، یہ بادلوں کی رنگتیں
یہ رنگ و روپ ہیں مرے ، میں ان میں آشکار ہوں

(۵)

ہر ایک شاخسار میں مجھی سے آب و رنگ ہے
پھپکتے ہیں درخت جو ، یہ میری ہی امنگ ہے
پھدکتے ہیں پرند سب ، مجھی سے یہ ترنگ ہے
کرشمے دیکھ کر مرے ، ہر ایک عقل دنگ ہے
ہیں کھیل نت نئے مرے ، میں وہ طلسم کار ہوں

(۶)

گلوں کے رنگ رنگ سے ، عیاں ہیں جھلکیاں مری
چمن کے غنچے غنچے میں شمیم ہے نہاں مری
زباں پہ پتے پتے کی رواں ہے داستاں مری
سُرنگ پود پود کی جڑوں میں ہے دواں مری
میں روحِ سبزہ زار ہوں ، میں نازشِ بہار ہوں

زندگی

ذرّے ذرّے میں دواں روحِ رواں پاتا ہوں میں
زندگی کو ایک بحرِ بے کراں پاتا ہوں میں

غنچہ غنچہ نطق پر آمادہ آتا ہے نظر
پتّے پتّے کی زباں کو نغمہ خواں پاتا ہوں میں

زندہ ہستی کی خبر دیتی ہے رفتارِ نفس
بوئے گُل کو زندگی کا ترجماں پاتا ہوں میں

برق کی جنبش ہو یا بادِ صبا کا ہو خرام
زندگی کا ہر تموّج میں نشاں پاتا ہوں میں

چپّہ چپّہ اس مکاں کا ہے مکینوں سے بھرا
زندگی کو شش جہت میں حکمراں پاتا ہوں میں

اس سے آگے بھی ہیں روحیں اڑتی پھرتی بے شمار
طائرِ سدرہ کا جس جا آشیاں پاتا ہوں میں

ہو چکی ہے حکمراں جس نخل پر بادِ خزاں
اس کی رگ رگ میں بہارِ بے خزاں پاتا ہوں میں

چارسو راہِ سفر پر دوڑتی ہے جب نظر
زندگی کو کارواں در کارواں پاتا ہوں میں

جانے والوں کی تباہی کے نشانوں میں نہاں
آنے والی ہستیوں کی بستیاں پاتا ہوں میں

الغرض سمجھے ہو جن کو موت کی بربادیاں
زندگی کے انقلاب اُن میں نہاں پاتا ہوں میں

دعوتِ انقلاب

کیا سنے گا خاکِ مردہ و افتادہ بن کے تو
طوفان بن کہ ہے تری فطرت میں انقلاب

کیوں ٹمٹمائے کرمکِ شب تاب کی طرح
بن سکتا ہو تو اوجِ فلک پر اگر شہاب

وہ خاک ہو کہ جس میں ملیں ریزہ ہائے زر
وہ سنگ بن کہ جس سے نکلتے ہیں لعلِ ناب

چڑیوں کی طرح دانے پہ گرتا ہو کس لیے
پرواز رکھ بلند کہ تو بن سکے عقاب

وہ چشمہ بن کہ جس سے ہوں سرسبز کھیتیاں
رہ رو کو تو فریب نہ دے صورتِ سراب

درگا سہائے سرور جہاں آبادی

"لکشمی جی"

سبھا صورت وہ عجب تھی وہ عجب سبھ تھی لگن   کہ جب آکاش سے اترا تھا ترا سنگھاسن
نظر آئی تری صورت میں عجب حسن کی جوت   تو نے دیوی ہمیں اپنے جو دکھائے درشن
اک چکاچوند کا عالم دمِ نظارہ تھا   گورا گورا تنِ نازک تھا سراپا کندن
شعلۂ حسنِ دل افروز بھڑک اٹھتا تھا   رخِ روشن پہ جو پڑ جاتی تھی سورج کی کرن
تھی چمک آہ ترے چاند سے رخساروں کی   کسی مندر میں تھے یا گھی کے دیے دو روشن
ترچھی بانکی وہ کمانیں تھیں، کڑی دونوں بھویں   لیے پھرتے تھے کبھی من میں جنھیں رام لچھمن
رخِ تاباں پہ برستا تھا ترے نورِ ازل   بن کے ساونکی جھڑی اور کبھی بھادوں کی برن
کوکلا سی وہ تری ہائے سریلی آواز   میٹھے میٹھے ترے ڈوبے ہوئے امرت میں بچن
گوری گوری تھی جبیں برج کی سندر کوئی نار   زلف تھی یا کوئی متھرا کی سکھی شام برن
خوش نما کانوں میں کنڈل تھے تو ہاتھوں میں کنول   اوڑھنی ہلکی سی ریشم کی تھی اک زیبِ بدن
تو اس انداز و ادا سے جو زمیں پر اتری   دیکھنے والوں نے جھک جھک کے لیے تیرے چرن
اہلِ نظارہ سے تصویر تری بول اٹھی   لکشمی ہوں تمھیں دینے کو میں آئی درشن

دلِ بے قرار سوجا

کسی مستِ ناز کا ہے عبث انتظار سوجا   کہ گزر گئی شب آدھی دلِ بے قرار سوجا

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غم گسار سو جا

یہ تری صدائے نالہ مجھے متّہم نہ کر دے
مرے پردہ دار سو جا مرے رازدار سو جا

ابھی دہان پان ہی تو نہیں عاشقی کے قابل
یہ تپش کا آہ شیوہ نہ کر اختیار سو جا

نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اٹھا لوں
تجھے سینے سے لگا لوں تجھے کروں پیار سو جا

تجھے جن کا ہی تصور ارے مستِ جامِ الفت
ابھی انکھڑیوں کے صدقے مرے بادہ خوار سو جا

تجھے پہلا سابقہ ہی شبِ غم بری بلا ہی
کہیں مر مٹے نہ ظالم دلِ بے قرار سو جا

بھونرے کی بے قراری

نہ وہ کیتکی کی پھبن رہی
نہ وہ موتیا کی ادا رہی

نہ وہ نسترن کی سمن رہی
نہ وہ گل رہے نہ فضا رہی

نہ گلوں کے اب ہیں وہ قہقہے
نہ وہ بلبلوں کے ہیں چہچہے

نہ غزل سرا وہ کوئی رہے
نہ وہ قمریوں کی صدا رہی

نہ وہ سرو ہی نہ وہ آب جو
نہ وہ ہم سفیر ہیں خوش گلو

نہ بنفشہ ہی نہ وہ نازبو
نہ وہ جعفری نہ حنا رہی

نہ وہ صبح کی ہیں تجلّیاں
نہ شفق کی آہ! جھلکیاں

نہ وہ اودی اودی ہیں بدلیاں
نہ وہ بھینی بھینی ہوا رہی

نہ امنگیں ہیں وہ شباب کی
نہ وہ پتّیاں ہیں گلاب کی

نہ ہوا میں بو ہی شراب کی
مجھے مست تھی جو بنا رہی

وہ کنول غضب کے تھے دل ربا
وہ جو اڑتے تھے مرے ہم نوا

مگر اب نہ ان کی ہے وہ ادا — نہ وہ بو رہی نہ صفا رہی
لب آب جو تھی فضا غضب — وہ بہار کی تھی ہوا عجب
مرے کنج میں مجھے روز و شب — مئے بے خودی تھی پلا رہی
وہ غضب کی کوکو وہ زمزمہ — وہ سریلی درد بھری صدا
سر شام سرو پہ فاختہ — مجھے لوریاں تھی سنا رہی
ہیں کنول کی خشک جو پتّیاں — مری خواب گہ تھی کبھی یہاں
یہیں شب کو دے دے کے تھپکیاں — تھی نسیم مجھ کو سلا رہی
یہاں ننھی جوہی کی اک کلی — جو بہار کے نازوں کی تھی پلی
مجھے لگتی جس کی ادا بھلی — مجھے کنج میں تھی بلا رہی
یہاں گل شگفتہ تھے جا بجا — یہاں ننھا ڈیزی تھا ہنس رہا
یہاں مسکراتی تھی سوسنیا — یہاں چمپا ادا تھی دکھا رہی
نہ گلوں میں بوئے وفا رہی — نہ وہ دل فروز ادا رہی
نہ چمن رہا نہ فضا رہی — نہ وہ دن رہے نہ ہوا رہی
نہ روش ہوا اب وہ سیر کی — نہ گلوں میں بو ہے وہ مہر کی

کہ ہوا ہے گلشن دہر کی
مجھے سبز باغ دکھا رہی

سیماب اکبرآبادی

انقلاب

برہم نظام عالمیاں دیکھتا ہوں میں
یہ کیا تغیرات یہاں دیکھتا ہوں میں

برپا سمندروں میں ہیں طوفان آگ کے
موج ہوا کو شعلہ فشاں دیکھتا ہوں میں

اس خاک پر جو حامل آب حیات تھی
انساں کا خون گرم رواں دیکھتا ہوں میں

بے رُت کے بادلوں کی طرح ہر طرف محیط
مظلومیت کے دل کا دھواں دیکھتا ہوں میں

اب اُن مبصروں کو جو یک سو نگاہ تھے
اندیشہ مند سود و زیاں دیکھتا ہوں میں

جن رہبروں کے نقش قدم شمع راہ تھے
ان کو بہ کار راہ زناں دیکھتا ہوں میں

ان خاکیوں کو جن پہ بساط زمیں ہے تنگ
دوش ہوا پہ رقص کناں دیکھتا ہوں میں

ان فانیوں میں جو نہیں مختار یک نفس
زعم حکومت دو جہاں دیکھتا ہوں میں

سوز دروں ہے سانس کے پردے میں نوحہ گر
رنگیں لبوں کو سحر فغاں دیکھتا ہوں میں

حسن فسردہ دل کی تبسم [illegible]
سردی کی چاندنی کا سماں دیکھتا ہوں میں

عشق ستم زدہ کے شباب ملیح پر
ٹھٹھرے ہوئے چمن کی خزاں دیکھتا ہوں میں

انساں شکار آب و ہوائے زمانہ ہے
نشتر بجائے ہر رگ جاں دیکھتا ہوں میں

ہے خون لالہ زار سے بھیگی ہوئی بہار
بربادیوں کو مرثیہ خواں دیکھتا ہوں میں

ہے غارت چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ
شاخوں پر انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

سیماب کون ہے مرے احساس میں شریک
کس کی نظر وہاں ہے جہاں دیکھتا ہوں میں

صدا بہ صحرا

کنارِ رودِ چمن سے تجھے پکار رہا ہوں
نقوشِ رفتہ تہہ موج سے ابھار رہا ہوں

پھر آج دیدۂ پرنم میں ہے ترا رُخِ رنگیں
میں آج چاند کو گنگا میں پھر اتار رہا ہوں

اسی جہت سے کر اندازہ میری کاوشِ غم کا
کہ نوکِ خار سے زلفِ چمن سنوار رہا ہوں

تجلیوں پہ تری دسترس جو مجھ کو نہیں ہے
تو سنگ و خشت پہ گھبرا کے ہاتھ مار رہا ہوں

یہ آرزو ہے کہ پھر دعوتِ خرام تجھے دوں
کنول کو آنسوؤں سے دھو کے پھر نکھار رہا ہوں

فقیرِ خاک بسر ہوں مگر ہے اب بھی یہ جرأت
ترے جمال پہ دونوں جہاں کو وار رہا ہوں

نوا کو اپنی لبِ آسودہ رہنے دے کچھ دن
ابھی میں بگڑے ہوئے ساز کو سدھار رہا ہوں

محیطِ نور ہے سیماب میری فکرِ درخشاں
زلالِ زنگ کے انبار سے نتھار رہا ہوں

غزل

چمک جگنوں کی برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے
قفس میں رہ کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

سحر تک سعیِ نالہ رائگاں معلوم ہوتی ہے
یہ دنیا تو بقدرِ یک فغاں معلوم ہوتی ہے

کسی کے دل میں گنجائش نہیں وہ بارِ ہستی ہوں
لحد کو بھی مری مٹی گراں معلوم ہوتی ہے

خزاں کے وقت بھی خاموش رہتی ہے فضا ساری
چمن کی پتّی پتّی رازداں معلوم ہوتی ہے
چمن کے سانحے کو مدّتیں گزریں مگر اب بھی
چمکتی ہے جو بجلی آشیاں معلوم ہوتی ہے
ہوائے شوق کی قوت وہاں سے آئی ہے مجھ کو
جہاں منزل بھی گردِ کارواں معلوم ہوتی ہے
ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبّت کی
جہاں محسوس ہوتی ہے وہاں معلوم ہوتی ہے
قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے
کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے
نہ کیوں سیمابؔ مجھ کو قدر ہو ویرانیِ دل کی
یہ بنیادِ نشاطِ دو جہاں معلوم ہوتی ہے

ضبط سے ناآشنا ہم، صبر سے بیگانہ ہم
انجمن میں ہیں شریکِ قسمتِ پروانہ ہم
خود ہی سازِ بے خودی کو چھیڑ دیتے ہیں کبھی
خود ہی سنتے ہیں حدیثِ ساغر و پیمانہ ہم
دفعتاً سازِ دو عالم بے صدا ہو جائے گا
کہتے کہتے رُک گئے جس دن ترا افسانہ ہم
وحدت و کثرت میں ہیں دو جلوہ گاہیں دوست کی
اک تجلّی خانہ دُنیا، اک تجلّی خانہ ہم

دل جلا پھر خود سے جلے پھر ساری دُنیا جل اٹھی
سوز لائے تھے بہ مقدارِ پرِ پروانہ ہم

جب ہمیں دیوانہ بننا ہے تو کیسی مصلحت
مصلحت کو بھی بنا لیں گے ترا دیوانہ ہم

قفس سے چھوٹ کے بڑی دیر میں ٹھکانہ ملا
خیال سے بھی کہیں دور آشیانہ ملا

تعینات کے پردوں میں چھپ کے بیٹھ گئے
حجاب کا یہ انھیں اور بھی بہانہ ملا

سُنا ہے طور پہ تم بے حجاب آئے تھے
یہ رشک ہے کہ ہمیں کیوں نہ وہ زمانہ ملا

ساغر نظامی

ترانۂ وطن

اے وطن اے وطن اے وطن
جانِ من جانِ من جانِ من
ذرّے ذرّے میں محفل سجادیں گے ہم   تیرے دیوار و در جگمگا دیں گے ہم
تجھ کو ہستی کا گلشن بنا دیں گے ہم   آسمانوں پہ تجھ کو بٹھا دیں گے ہم
بن کے دشمن ترا جو اٹھے گا یہاں
اس کو تحت الثریٰ میں گرادیں گے ہم
اور تحت الثریٰ کو فنا کے سمندر میں ارتھی بنا کر بہادیں گے ہم
اے وطن اے وطن اے وطن
سُن لیں یہ انس و جان و زمین و زمن
اے وطن اے وطن اے وطن
جانِ من جانِ من جانِ من

(۲)

سونے والوں کو اک دن جگادیں گے ہم   آسمان و زمیں کو ہلا دیں گے ہم
بربریت کے ٹکڑے اڑا دیں گے ہم   رسم و راہِ غلامی مٹا دیں گے ہم
کون کہتا ہے کم زور و بے بل ہیں تو
ہر طرف خوں کے دریا بہا دیں گے ہم

جس طرف سے پکارے گا ہندوستاں اس طرف ہی وفا کی صدا دیں گے ہم
ای وطن، ای وطن، ای وطن
سر سے باندھے ہوئے ہیں کفن ہی کفن
ای وطن، ای وطن، ای وطن
جانِ من، جانِ من، جانِ من

(۳)

تیری ہستی ہمالہ کی چوٹی بنی   ماہ و خورشید کی اس پہ بندی لگی
روشنی شرق سے غرب تک ہو گئی   سجدہ میں جھک گئی عظمتِ زندگی
عظمتِ زندگی کی قسم ہے ہمیں
تیری عزت پہ سر تک کٹا دیں گے ہم
وقت آنے دے ای جاں ترے نام پر اپنی ہستی و مستی مٹا دیں گے ہم
ای وطن، ای وطن، ای وطن
خون سے اپنے بھر دیں گے گنگ و جمن
ای وطن، ای وطن، ای وطن
جانِ من، جانِ من، جانِ من

(۴)

مست و خوش بو ہواؤں سے شیتل ہے تو   مادھری ہے منوہر ہے کومل ہے تو
پریم مدرا کی لبریز چھاگل ہے تو   سر پہ دنیا کے رحمت کا بادل ہے تو
آنکھ اٹھا کے جو دیکھا کسی نے تجھے
چھاؤنی اپنی لاشوں سے چھا دیں گے ہم
تیرے پاکیزہ پیکر کو روحوں کی باریک چادر کے نیچے چھپا دیں گے ہم

اے وطن اے وطن اے وطن
تجھ پہ قربان زر و مال و جاں اور تن
اے وطن اے وطن اے وطن
جانِ من ، جانِ من ، جانِ من

(۵)

تیری ندیاں رسیلی مدھر نغمہ خواں   تیرے پربت تری عظمتوں کے نشاں
تیرے جنگل بھی ہنستے ہوئے گلستاں   تیرے گلشن بھی رشکِ بہارِ جناں
زندہ باد اے غریبوں کے ہندوستاں
تیرا سکّہ دلوں پہ بٹھا دیں گے ہم
جو بھی پوچھے گا جنت کا ہم سے پتا راہِ کشمیر اس کو بتا دیں گے ہم
اے وطن اے وطن اے وطن
تو چمن در چمن ہے عدن در عدن
اے وطن اے وطن اے وطن
جانِ من ، جانِ من ، جانِ من

(۶)

گلشنِ عیش و آرام راحت ہے تو   بے کسی میں کنارِ محبت ہے تو
بے بسوں اور غلاموں کی دولت ہے تو   زندگی کے جہنم میں جنت ہے تو
سینچ کر خونِ دل سے تری کیاریاں
اور بھی تجھ کو جنت بنا دیں گے ہم
ہو وہ گلچیں کہ صیاد دونوں کے سر تیرے قدموں پہ اک دن جھکا دیں گے ہم
اے وطن اے وطن اے وطن

ہم ترے پھول ہیں تو ہمارا چمن
ای وطن! ای وطن، ای وطن
جانِ من ، جانِ من ، جانِ من

(۷)

جس کا پانی ہو امرت وہ مخزن ہو تو   جس کے دانے ہیں بجلی وہ خرمن ہو تو
جس کے کنکر ہیں ہیرے وہ معدن ہو تو   جس سے جنت ہو دُنیا وہ گلشن ہو تو
دیویوں دیوتاؤں کا مسکن ہو تو
تجھ کو سجدوں سے کعبہ بنا دیں گے ہم
تیری الفت نہیں سارے سنسار میں تیری عظمت کا ڈنکا بجا دیں گے ہم
ای وطن ، ای وطن ، ای وطن
یہ پھبن یہ وقار اور یہ بانکپن
ای وطن ، ای وطن ، ای وطن
جانِ من ، جانِ من ، جانِ من

(۸)

یہ ستارے یہ نکھرا ہوا آسماں   آسماں سے ہمالہ کی سرگوشیاں
یہ تری عظمتوں کا اٹل راز داں   مستقل ، معتبر ، محتشم راز داں
اس کی چوٹی سے خوں ریز دُنیا کو پھر
ہم پیامِ حیات و وفا دیں گے ہم
پھر محبت کا نغمہ سنا دیں گے ہم پھر زمانے کو جینا سکھا دیں گے ہم
ای وطن ، ای وطن ، ای وطن
زندگی پھر بھی لیگی ہماری شرن

اے وطن ، اے وطن ، اے وطن
جانِ من ، جانِ من ، جانِ من

سماج

کھِل کھِلاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا جانِ بہار   اے مری جانِ بہار
خندہ جز شورشِ آغازِ بلا کچھ بھی نہیں
نغمہ جز ماتمِ تابوتِ صدا کچھ بھی نہیں
ہر روشِ صحنِ گلستاں کی مزارِ بو ہے
گود میں موجِ تبسم کی فقط آنسو ہے
جگنوؤں کا یہ چراغاں ہے شراروں کا فریب
لالہ و گل کا تبسم ہے بہاروں کا فریب
کھِل کھِلاتے ہوئے چہروں پہ نہ جا جانِ بہار   اے مری جانِ بہار
چہچہاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا جانِ سخن   اے مری جانِ سخن
جھوٹ نے مستیِ گفتار میں بدلا ہے لباس
غیبت و کذب کی رنگین و تراشیدہ اساس
بحرِ تکذیب کے ٹھہرے ہوئے دھارے ہیں یہ ہونٹ
یا جہنم کے دریچوں کے کنارے ہیں یہ ہونٹ
جھوٹ سے فاش نہ ہونے کی قسم لیتے ہیں
سچ کو اِک آن میں الہام بنا دیتے ہیں
چہچہاتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا جانِ سخن   اے مری جانِ سخن

شہد آمیز نگاہوں پہ نہ گر کیفِ نظر
اے مرے کیفِ نظر
یوں تو شیریں ہیں یہ مئے زیست کے جام
لیکن احساس میں یہ جام ہیں زہرابِ تمام
تلخیاں جھانک رہی ہیں کوئی جیتا تو نہیں
بادۂ عیشِ جہاں میں کوئی پیتا تو نہیں
میٹھی میٹھی یہ نگاہیں یہ تبسم یہ نیاز
سب کے پردے میں ہے اک تلخ حقیقت غماز
شہد آمیز نگاہوں پہ نہ گر کیفِ نظر
اے مرے کیفِ نظر
گنگناتی ہوئی باہوں پہ نہ جا سازِ خیال
اے مرے سازِ خیال
استعارہ ہیں یہ ہیروں سے لدی ٹہنی کا
اک ستون چاہیے اس بیل کو زردوزی کا
حلقہ کرتی ہیں یہ زریں کمر و گردن کا
عکس پڑتا ہے بہاروں پر ہی اس گلشن کا
فن ہو یا حُسن جوانی ہو کہ پیغامبری
ہار پڑتا نہیں مفلس کے گلے میں یہ کبھی
گنگناتی ہوئی باہوں پہ نہ جا سازِ خیال
اے مرے سازِ خیال
عطر آلود نگاہوں پہ نہ جا روحِ گلاب
اے مری روحِ گلاب
اس طرف دیکھ کہ تو دیکھ کے رہ جائے گا دنگ
عہدِ تہذیب میں بھی آدمی ہے ننگ دھڑنگ
ہے یہی مرکزِ لو اور یہی مخزنِ رنگ
جسمِ عریاں پہ مگر جامۂ افلاس ہے تنگ

توشہ خانے سے غریبوں کے اڑے ہیں یہ لباس
خونِ مزدور کی خوشبو میں بسے ہیں یہ لباس
عطر آلود لباسوں پہ نہ جا روحِ گلاب   اے مری روحِ گلاب
ان خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ حسنِ نظر   اے مرے حسنِ نظر

چلتے پھرتے جو نظر آتے ہیں تہذیب کے بت
ترشے ترشائے ہوئے آزری تادیب کے بت
ان کے دل سنگ ہیں جاں سرد ہے سینے تاریک
ان کے دریا ہیں سراب ان کے سفینے تاریک
کوئی در ان پہ سیہ کاریوں کا بند نہیں
جانِ ابلیس ہیں تہذیب کے فرزند نہیں
ان خطرناک کھلونوں پہ نہ مٹ حسنِ نظر   اے مرے حسنِ نظر
رنگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا کشتِ حیات   اے مری کشتِ حیات

کبھی مجبور پہ ہو بارشِ الطافِ امیر
ایک ہو جائے کبھی قسمتِ صیاد و اسیر
زہر خود شہد بنے آب ہو خود موجۂ شیر
اپنی ہر کاٹ سے پیدا کرے امرت شمشیر
جذبۂ جبر کے ہونٹوں پہ تبسم ہو محال
ظلم کی روح کو احساسِ ترحم ہو محال
رنگ زاروں کی گھٹاؤں پہ نہ جا کشتِ حیات
مسکراتی ہوئی آنکھوں پہ نہ مٹ حسنِ نظر   اے مرے حسنِ نظر

شاد عظیم آبادی

اگر مرتے ہوئے لب پر نہ تیرا نام آئے گا
تو میں مرنے سے درگزرا مرے کس کام آئے گا

شبِ ہجراں کی سختی ہو تو ہو لیکن یہ کیا کم ہے
کہ لب پر رات بھر رہ رہ کے تیرا نام آئے گا

عطا کی جب کہ خود پیرِ مغاں نے پی بھی لے زاہد
یہ کیسا سوچنا ہے تجھ پہ کیوں الزام آئے گا

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوب اے ساقی
خُم آئے گا، صراحی آئے گی تب جام آئے گا

غضب نگاہ نے ساقی کی بندوبست کیا
شراب بعد کو دی پہلے سب کو مست کیا

مئے خودی نے کچھ ایسا دلوں کو مست کیا
کسی نے دھیان نہ پھر سوئے بود و ہست کیا

کوئی خفا ہو تو ہو امرِ حق مگر یوں ہے
بتوں کی چال نے سب کو خدا پرست کیا

بہت سے جام تھے پیرِ مغاں کے پیشِ نگاہ
کسی کو نیست کیا اور کسی کو ہست کیا

بلا سے صاف نہ دی، یہ شرف نہیں کچھ کم
سیاہ کاروں کو ساقی نے مے پرست کیا

نہ سر میں سودا نہ دل میں آہیں نہ لب پہ ساقی فغاں رہے گی
یہی جو ساماں ہیں یہ نہ ہوں گے تو پھر محبّت کہاں رہے گی

بنا چلا ڈھیر راکھ کا تو بجھا چلا اپنے دل کی لیکن
بہت دنوں تک دبی دبائی یہ آگ اے کارواں رہے گی

بہت تنکے چنتے تھے میں نے نہ مجھ سے صیّاد تو خفا ہو
قفس میں گر مر بھی جاؤں گا میں نظر سوئے آشیاں رہے گی

ابھی سے ویرانہ پن عیاں ہے ، ابھی سے وحشت برس رہی ہے
ابھی تو سنتا ہوں کچھ دنوں تک بہار اے آشیان رہے گی
ہزار نقشِ قدم مٹا کر زمانہ آنکھوں میں خاک ڈالے
جو تجھ سے چھوٹے ہیں ان کو تیری تلاش اے کارواں رہے گی

رہے ہر حال میں جو مطمئن جینا اسی کا ہے
پلائے جس کو خود پیرِ مغاں پینا اسی کا ہے
نگہ کی برچھیاں جو سہہ سکے سینہ اسی کا ہے
ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے
یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

دیکھا کیے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

لے کے خود پیرِ مغاں ہاتھ میں مینا آیا
مے کشو شرم کہ اس پر بھی نہ پینا آیا
آج تک دامنِ گل چاک ہے خیاطِ ازل
تجھ کو خلعت بھی حسینوں کا نہ سینا آیا

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا

ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

میں حیرت وحسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریاے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
مرغانِ ہوا نے پھولوں کو اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے
آنا ہے اگر تو آجاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

شب کو مری چشمِ حسرت کا سب دردِ دل ان سے کہہ جانا
دانتوں میں دبا کر ہونٹ اپنا کچھ سوچ کے ان کا رہ جانا
ہم باغ میں ناحق آئے تھے بلبل کی حکایت سننے کو
منقار کو رکھ کر پھولوں پر کچھ اپنی زباں میں کہہ جانا

یہ رات بھیانک ہجر کی ہے کاٹیں گے بڑے آلام سے ہم
ٹلنے کی نہیں یہ کالی بلا سمجھے ہی ہوئے تھے شام سے ہم
تھا موت کا کھٹکا جاں فرسا، صد شکر کہ نکلا وہ کانٹا
گر ہو نہ قیامت کا دھڑکا اب ہیں تو بڑے آرام سے ہم
اے ہم نفسو دم لینے دو وہ بھولے نغمے یاد آ لیں
آئے ہیں چمن میں اڑ کے ابھی چھوٹے ہیں ابھی دام سے ہم
وہ سمجھے کہ میں نے مار لیا ہم سمجھے ملیں گے آخر وہ
ملتے ہی نگہ کے دونوں خوش آغاز سے وہ انجام سے ہم
دنیا میں تخلص کوئی نہ تھا کیا نیل کا ٹیکا شادؔ ہی تھا
تم وجہ نہ پوچھو کچھ اس کی چڑ جاتے ہیں کیوں اس نام سے ہم

احمد علی شوق

عالمِ خیال (دوسرا رخ)

[عورت اپنے شوہر کے آنے کی امید میں ہے۔ شوہر کا خط عذر کے ساتھ پردیس سے آیا کہ وہ ابھی نہیں آ سکتا۔ عورت بے چین ہو کر شوہر کو خط لکھ رہی ہے۔ اور اپنے خیالات ظاہر کرتی ہے۔]

پا کے تمھارے خط کو آج دل کی تڑپ بڑھی کچھ اور
دل میں بھڑک کے غم کی آگ جسم پہ تپ چڑھی کچھ اور
دل کی طرف تھی جو نگاہ یاس سے اب زمیں پہ ہے
ہاتھ کبھی جگر پہ ہے اور کبھی جبیں پہ ہے
ضعف سے جسم لٹ چلا روح بدن سے ہٹ چلی
چہرے کا رنگ کٹ چلا نبض کی چال گھٹ چلی
خط ہے تمھارے ہاتھ کا پڑھتی ہوں اس کو بار بار
کھولتی ہوں ہزار بار، چومتی ہوں ہزار بار
سب کے جگر میں خون ہے میرے جگر میں درد ہے
سب کا شباب لال ہے، میرا شباب زرد ہے
دل میں بسے ہو تم مگر چوس رہے ہو خون کو
سر میں خیال بن کے تم دیتے ہو شہ جنون کو

رکھتے نہیں یہ ہونٹ رنگ رکھتے نہیں یہ گال رنگ
تم نہیں تو نظر میں ہے خون کا رنگ لال رنگ

خاک میں چوڑیاں ملیں، جی کو جلا رہی ہیں یہ
بھاڑ میں جائیں بجلیاں آگ لگا رہی ہیں یہ

تم میں وفا ہو یا نہ ہو میں یہ کہوں گی ہے ضرور
ہاں یہ کہوں گی راہ کو روکے ہے کوئی شے ضرور

جذب میں کاش ہو یہ زور جو تمھیں لائے کھینچ کر
گھر مری پتلیوں کے ہیں ان میں بٹھائے کھینچ کر

کانپ کے دل میں لاؤ خوف اپنے خدا کا تم کبھی
اپنی وفا سے دو جواب میری وفا کا تم کبھی

آتی ہیں ہم نشیں مگر مجھ میں نہیں ہنسی مری
شرم سے کیا کہوں کہ "وہ" لے گئے دل لگی مری

پوچھتی ہیں تو کیا کہوں چھیڑتی ہیں تو کیا کہوں
سادھ کے چپ لہو کے گھونٹ بیٹھی ہوئی پیا کروں

جھولنے کو جو وہ کہیں جاؤں میں اٹھ کے جبر سے
گائیں تو گاؤں ان کے ساتھ غم کو چھپا کے صبر سے

کی نہیں میں نے کچھ خطا، کی ہو تو بھول جاؤ تم
مجھ کو نہ دیکھنا مگر خیر سے گھر کو آؤ تم

آؤ جو تم تو رخ پہ میں آنچل اٹھا کے ڈال لوں
اس میں تو کچھ حرج نہیں، جھانک کے دیکھ بھال لوں

عورت اگر میں ہو پڑی اس میں مری خطا نہیں

یہ تو کہو کہ تم پہ کچھ میرا بھی حق ہے یا نہیں
پردہ میں رہ کے عورتیں مرتی ہیں گو قضا نہ ہو
شرم کا حق ادا کریں چاہ کا حق ادا نہ ہو
مجھ کو یقین ہے کہ تم آکے مجھے نہ پاؤگے
آکے نہ پاؤگے تو کیا میری لحد پہ آؤگے
فاتحہ بھی پڑھوگے تم ہاتھ اٹھا کے یا نہیں
روح کو خوش کروگے تم پھول چڑھا کے یا نہیں

ظفر علی خان

خُمستانِ ازل کا ساقی

پہنچتا ہے ہر اک مے کش کے آگے دورِ جام اس کا
کسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لطفِ عام اس کا
گواہی دے رہی ہے اس کی یکتائی پہ ذات اس کی
دوئی کے نقش سب جھوٹے ہیں سچا ہے ایک نام اس کا
ہر اک ذرہ فضا کا داستاں اس کی سناتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا آ کے دیتا ہے پیام اس کا
میں اس کو کعبہ و بت خانے میں کیوں ڈھونڈنے نکلوں
مرے ٹوٹے ہوئے دل ہی کے اندر ہے قیام اس کا
مری افتادگی بھی میرے حق میں اس کی رحمت تھی
کہ گرتے گرتے بھی میں نے لیا دامن ہے تھام اس کا
وہ خود بھی بے نشاں ہے زخم بھی ہیں بے نشاں اس کے
دیا ہے اس نے جو چرکا نہیں ہے التیام اس کا
نہ جا اس کے تحمل پر کہ ہے بے ڈھب گرفت اس کی
ڈر اس کی دیرگیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

حکومت التجاؤں سے کبھی حاصل نہیں ہوتی — کوئی اللہ کا بندہ یہ کہہ دے مالوی جی سے

کبھی بھی سیدھی انگلی سے نہ نکلا ہو نہ نکلے گا
چھیڑنا چاہتے ہیں اپنے پھلکے آپ جس گھی سے
رزولیوشن کہاں تک پاس کرتے ہم چلے جائیں
یہ چکنی کانگریس بیٹھی ہوئی کس وقت تک پیسے
نہیں ملتی ہی جلسوں اور تقریروں سے آزادی
جو ملتی ہو تو ملتی ہو پھبتی اور لٹھیتی سے
وہ گوکل کا گوالا جو ہو بیٹھی بانسری والا
یہ کہتا ہو کہ بھینس اس کی جو ہانکے اس کو لاٹھی سے

سخنورانِ عہد سے خطاب

اے نکتہ ورانِ سخن آرا و سخن سنج
اے نغمہ گرانِ چمنستانِ معانی
مانا کہ دل افروز ہی افسانۂ عذرا
مانا کہ دل آویز ہی سلمیٰ کی کہانی
مانا کہ اگر چھیڑ حسینوں سے چلی جائے
کٹ جائے گا اس مشغلے میں عہدِ جوانی
گرمائے گا یہ ہمہمہ افسردہ دلوں کو
بڑھ جائے گی دریائے طبیعت کی روانی
مانا کہ ہیں آپ اپنے زمانے کے نظیری
مانا کہ ہر اک آپ میں ہی عرفیِ ثانی مشغلہ
مانا کہ حدیثِ خط و رخسار کے آگے
بے کار ہی مشائیوں کی فلسفہ دانی
مانا کہ یہی زلف و خط و خال کی روداد
ہی مایۂ گل کاریِ ایوانِ معانی
لیکن کبھی اس بات کو بھی آپ نے سوچا
یہ آپ کی تقویم ہی صدیوں کی پرانی
معشوق نئے بزم نئی رنگ نیا ہی
پیدا نئے خامے ہوئے ہیں اور نئے مانی
مژگاں کی سناں کے عوض اب سنتی ہی محفل
کانٹوں کی کھٹکتا برہنہ پائی کی زبانی
لذت وہ کہاں لعلِ لبِ یار میں ہی آج
جو دے رہی ہی پیٹ کے بھوکوں کو کہانی
بدلا ہی زمانہ تو بدلیے روش اپنی
جو قوم ہی بیدار یہ ہی اس کی نشانی
اے ہم نفسو یاد رہے خوب یہ تم کو
بستی نئی مشرق میں ہمیں کو ہی بسانی

"چھو" کی لفظی تحقیق

اشنان کرنے گھر سے چلے لالہ لال چند
اور آ گئے آگے لالہ کے اُن کی بہو گئی
پوچھا جو مَیں نے لالہ للائن کہاں گئیں
نیچی نظر سے کہنے لگے وہ بھی چھو گئی
مَیں نے دیا جواب انھیں ازرہِ مذاق
کیا وہ بھی کوئی چھت تھی کہ بارش سے چو گئی
کہنے لگے کہ آپ بھی ہیں مسخرے عجب
اب تک بھی آپ سے نہ تمسخر کی خو گئی

"چھو" ہوشیارپور میں ندی سے ہے مراد
بی بی تمیز بھی وہیں کرنے وضو گئی
مَیں نے کہا کہ "چھو" سے اگر ہے مراد 'جُو'
پھر یوں کہو کہ تا بہ لبِ آبِ جو گئی
کیوں اینٹھتے ہیں ماش کے آٹے کی طرح آپ
دھوتی سے آپ کی نہیں ہلدی کی بُو گئی

لطفِ زباں سے کیا ہو سروکار آپ کو
دامن کو آپ کے نہیں تہذیب چھو گئی
ہندی نے آ کے جیم کو چے سے بدل دیا
جو آئی کھسیانی میں گلشن سے جو گئی

لہجہ ہوا درشت زباں ہوگئی کرخت
لطفِ کلام و شستگیٔ گفتگو گئی
معنی کو ہے گلہ کہ ہوا بے حجاب میں
شکوہ ہے لفظ کو کہ مری آبرو گئی
افسوس ملک میں نہ رہی فارسی کی قدر
مستی اُڑی شراب سے پھولوں سے بو گئی

ظریف لکھنوی

افیونیوں کا رجز (۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء)

ہم لوگ ہیں افیونی جب رنگ جمادیں گے
جرمن ترے نقشے کو مٹی میں ملادیں گے
تو ہم سے بہادر یا ہم تجھ سے بہادر ہیں
پینک سے ذرا چونکیں پھر تجھ کو بتادیں گے
سرکار کے دشمن کو ہم کوس کے کھالیں گے
اور اپنے تصور سے نام اس کا مٹادیں گے
رستم سے سوا طاقت ہو جائے گی ہم سب میں
جب چائے میں بالائی تھوڑی سی ملادیں گے
لٹھ لے کے جہاں پہنچے سر توڑ دیا فوراً
جرمن تری توپوں میں ہم بانس چلادیں گے
زپلن) جو اُڑاتا ہو جرمن ہمیں کیا پروا
کنکوے میں چپٹا کر میدان میں گرادیں گے
اتنے تجھے ہم ڈھیلے ماریں گے اے جرمن
خاکی تری وردی کو مٹی میں ملادیں گے
تو مار بھی ڈالے گا تو یاد رکھ اے جرمن
بھتنا تجھے ہم بن کے راتوں کو ڈرادیں گے

ہم اُن سے ناخوش تھے اب اس سے بہت خوش ہیں
ٹھیکے پہ جو آئے گا افیون پلادیں گے
لوں سے کوئی کہہ دے کیوں لڑتے ہو اے آغا
تم جان اگر دوگے جرمن تمھیں کیا دیں گے
واللہ ظرافت ایسا لکھا یہ رجز تم نے
ہم سب کا ارادہ ہی چندے سے جلادیں گے

نئی تہذیب تجھ میں ہی نرالا جذبِ پنہانی
دھرم ہندو کا غائب اور مسلماں کی مسلمانی
نظر باز و، جوانی ہوگی اس کی دید کے قابل
ابھی تو گھٹنیوں چلنے لگا ہی ذوقِ عریانی

ستم ایجاد کہتے ہیں یہ کیوں معشوق کو شاعر
ستم بھی کیا کوئی کل ہی جسے ایجاد کرتے ہیں
بگولا ہیں کوئی معشوق، آندھی ہیں کہ جھکڑ ہیں
کہ چل کر عاشقوں کی خاک کو برباد کرتے ہیں

صفت تو دیکھیے ہر چند ہمت خود مونث ہی
زنانہ پہن کر جبا مئہ مردانہ آتا ہی
رقیب آئے تو اس سے چھوٹ لڑنے کا ارادہ ہی
پٹا آتا ہی، بانک آتی ہی، مجھ کو بانہ آتا ہی

گہ رخ پہ نقاب اس کے ہو گہ ہاتھ میں تلوار
معشوق وہ معشوق جو مادہ بھی ہو نر بھی

یہ حسن نرالا ہی کہ دو عضو ندارد
معشوق وہ ہی جس کے دہن بھی ہو کمر بھی

دور تک آہ رقیبوں کو بھگا آتی ہی   چھپر اڑ جاتے ہیں جب وقت ہوا آتی ہی
وہی کام آتے ہیں معشوق کو دنیا میں فقط   یا جفا آتی ہی یا اُن کو دغا آتی ہی

الفت میں ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہی   مجنوں نظر آتی ہی، لیلی نظر آتا ہی

یار کی محفل میں جو سامان تھا شاہانہ تھا
شمع گھنٹہ گھر تھی، ہاتھی سے بڑا پروانہ تھا

عظمت اللہ خاں

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا

مجھے بیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا — مرے جی کو یہ آگ لگا سی گئی
مجھے عیش یہاں کوئی پل نہ ملا — مرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی

مرے ننا یہ کے پوت تھے تم، سبھی ہم — رہے ایک جگہ پلے ایک ہی ساتھ
مرے باپ نے عمر جو پائی تھی کم — انھیں چھین کے لے گیا موت کا ہاتھ

میں تھی ننھی سی جان غریب بڑی — کبھی بھول کے دکھ نہ کسی کو دیا
نہ تو روٹھی کبھی نہ کسی سے لڑی — مری باتوں نے گھر ہی کو موہ لیا

تجھے تو بالے ہی تم پہ تھا تم کو بڑا — مرا دھیان کسی کی مجال نہ تھی
مجھے ٹیڑھی نظر سے کبھی دیکھے زرا — مجھے کھیل میں بھی تو کیا نہ دکھی

مرے سر میں تمھارا ہی دھیان بسا — مری چاہ کے راج دلارے بنے
تمھیں دیوتا مان کے من میں رکھا — مری بھول سی آنکھوں کے تارے بنے

مرا چتو ابھی سے ہی اس پہ فدا — یہ مکھولی ہی موہنی میری بہو
یہ بچی کا کہا مرے دل نے لکھا — وہیں ۰۰ گیا مرے منہ پہ لہو

اسی بات کے گھر میں جو چرچے ہوئے　　سبھی کہتے تھے مجھ کو تمھاری دلھن
مجھے تم نے بھی اپنے لگا کے گلے　　کئی بار کہا مری پیاری دلھن

اسی طرح گزر گئے چند برس　　بڑھی عمر ہماری حیا بھی بڑھی
تمھیں پڑھنے کی دھن لگی ایسی کہ بس　　بڑے شوق سے ساری پڑھائی پڑھی

مجھے تم نے پڑھایا بھی پہلے پہل　　مجھے پڑھنے کا خوب ہی شوق ہوا
لگی چلنے ترت نرے اپنے ہی بل　　آپ ہی علم کا ذوق ہوا

تمھیں پڑھنے کو دور جو بھیجا گیا　　بڑے شوق سے خوب ہی کام کیا
کوئی تم نے دقیقہ اٹھا نہ رکھا　　بڑی محنتیں کیں بڑا نام کیا

ہوئے پڑھ کے پجت تو عہدہ ملا　　ہوا گیان کا گن کا جو شہر میں نام
یہ مزے کا نیا ہی شگوفہ کھلا　　لگے مینہ کی طرح سے برسنے پیام

مرے نانا یہ بڑے تھے زمانہ شناس　　بڑے اونچے گھرانے میں ٹھیرا بیام
گیا ٹوٹ سا جی گئی ٹوٹ سی آس　　مری چاہ کا ہو گیا کام تمام

بڑی دھوم سے آئی تمھاری دلھن　　میں بھی کام میں بیاہ کے ایسی جُتی
کوئی اور تھی گو مری پیاری دلھن　　کہا سب نے بڑی ہے بہن کو خوشی

مرے دل کی کسی کو بھی تھی نہ خبر — مری چاہ کسی پہ نہ فاش ہوئی
بنی جان پہ اتنی کی اُف نہ مگر — مرے واسطے بَر کی تلاش ہوئی

مرا ایک جگہ جو پیام لگا — مرے دل سے تڑپ کے یہ نکلی دعا
نہیں چاہ ہی دل میں تو بیاہ ہو کیا — تو خدا یا یونہیں مجھے جگ سے اٹھا

مجھے چاہ نے کھا لیا گھن کی طرح — مری جان کی کل سی بگڑ ہی گئی
مرا جسم بھی بھن گیا بن کی طرح — یونہیں بسترِ مرگ پہ پڑ ہی گئی

مرا آخری وقت ہو آن لگا — کوئی اور تمھاری ہو "پیاری دلھن"
مجھے اب بھی تمھارا ہی دھیان لگا — نہ بنی پہ رہی ہوں تمھاری "دلھن"

مرے جیتے جی پیت کا پھل یہ ملا — مرے تن کو یہ آگ لگا ہی گئی
مجھے پیار کی ریت کا پھل یہ ملا — مرے تن کو یہ آگ جلا ہی گئی

پریت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۱)

کامنی کومل تھی تو
حسن رسیلا ترا
کوکتی کوئل تھی تو
شہد سریلا ترا

پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

(۲)

عشق کی دیوی تھی تو
شعر میں یکتا تھی تو
حسن کی پتلی تھی تو
ایک کویتا تھی تو

پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

(۳)

باز بہادر ترا
حسن کا شیدا رہا
تو نے اسے دل دیا
ایک سراپا وفا

پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

(۴)

خوب تھی قسمت تری
سات برس عیش تھے
شعر و سخن موسیقی
حسن حکومت کے مزے

پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

(۵)

دکھ کی جو آئی گھڑی
اور چھڑی راگنی

دن تھا نہ وہ رات تھی
عیش کی محفل اٹھی

پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۶)

اکبری لشکر کی موج
ایسی اُمڈ آئی تھی
باز بہادر کی فوج
بکھری پھٹی کائی سی

پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۷)

باز بہادر ترا
جان چھپا اڑ گیا
آنچ میں ڈالا گیا
تیرا دلِ بے وفا

پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۸)

باز بہادر کا تھا
تیرا جو دل ہو چکا
اور کسی کا بھلا
ہو سکے ممکن نہ تھا

پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

(۹)

ایک طرف تھی وفا
ایک طرف جان تھی
سچ کا تقاضا یہ تھا
جان ہی قربان تھی

پریت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

(۱۰)

موت تری موت تھی
عشق کی دیوی تری
موت تھی جان بھی
جس پہ ہو قربان کی

پریت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

(۱۱)

کوئی زبردست ہاتھ
تیری کڑی جھیلتا
دل کوئی مردانہ ساتھ
جان پہ یوں کھیلتا

پریت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

(۱۲)

چاہ کا اپنی دیا
ایسا دیا ہے جلا

اور بھی دے گا جلا
سانس اسے وقت کا

پیٹ کی ماری ستی شاعرہ روپا متی

"سندر صورت سندر ہی ہے رنگت گوری یا کالی"

اندھرا دیس کی سندر پتری کالی کوئل سی کالی
بال بھی کالے گھنگور گھٹا
ہونٹ وہ گدرے جامن کے سے اور ادا ہٹ میں لالی
دانت وہ اُجلے موتی کی جلا

بڑی بڑی سی آنکھ (اِ!) پُتلی بھونرا سی کالی
خمار اک مستانہ چھایا
وہ من موہنی مقناطیسی ان میں چمک ناگن والی
آنکھ اڑی اور دل کو لبھایا

اور سراپا گدرا گدرا سانچے میں ڈھلا لچکیلا
جوش جوانی پھٹتا جوبن
بھرا بھرا سا ڈھلا ڈھلایا وہ اک اک عضو سجیلا
وہ ہر چیز کا بے ساختہ پن

اک موج مچلتی مچلاتی چڑھتی اُترتی لہراتی

وہ گردن کا نفیس ڈھلاؤ

سینہ مستی کا جوالا مکھ کمر لچکتی بل کھاتی

وہ ہوش ربا آتار چڑھاؤ

سندر صورت سندر ہی ہے گوری یا کالی

فطرت نے ہو جس رنگ میں ڈھالی

فطرت کے لیے حسن یہی ہے دھج گرمانے والے

جان کی کھیتی جوتنے والی

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے

کوئی شے بھلی بری نہیں ہے کوئی بات یاں اٹل نہیں ہے

ہے یہ زندگی عجب پہیلی کوئی اس کا یاں تو حل نہیں ہے

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

کسی گود ماتا بھری کی میں بھی چین اور سکھ کبھی تھی

کسی آنکھ کی تھی میں بھی پتلی میں بھی نازوں میں کبھی پلی تھی

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

ابھی کچھ ہوئی نہ تھی سیانی کہ اٹھا بڑوں کا سر سے سایہ

تو زمانے نے یہ پلٹا کھایا کہ کسی کو کچھ نہ اپنا پایا

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

یہ کٹر دلوں کی تو تا چشمی میرے من میں تیر سی آ بیٹھی

گئی من کے پھول کی تراوٹ اڑی اوس کی طرح سے نیکی

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہو وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہو
نہ رہا کسی پہ کچھ بھروسا نہ رہا کوئی مرا سہارا
نہ رہی کسی کی پیٹھ ہی پیاری نہ رہا کوئی مرا ہی پیارا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہو وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہو
تھیں وہیں پڑوس میں طوائف تھا بڑا ہی نامی ان کا ڈیرا
مرے سر پہ ہاتھ انھوں نے رکھا مجھے پیار سے سبھوں نے گھیرا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہو وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہو
مجھے چاؤ چونچلوں سے پالا مری تربیت کا ڈول ڈالا
مجھے گانا ناچنا سکھایا مرے من کو تن بدن میں ڈھالا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہو وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہو
غرض اس طرح کی پا کے سکھشا نظر آئی زیست ایک میلا
ہیں جہاں جوئے کی سب دکانیں وہیں ہار جیت کا جھمیلا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہو وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہو
تھی حسینوں میں مری نہ گنتی نہ تو مور تھی نہ پٹ پری تھی
مرا رنگ سانولا سلونا مری نین بجلیاں بھری تھی
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہو وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہو
مرے بال کالے لانبے لانبے کہ اٹھا ہو ابر جیسے کالا
مرا سینہ بھی اڈتا بادل بھری بجلیوں سے تھرتھراتا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہو وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہو
مرے عاشقوں کی تھی نہ گنتی مرا فن بھی تھا بلند پایہ
مرے گرد دھن برس رہا تھا پیٹ دھنی ہوئی وہ دھن کمایا

وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہو وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہو
جو ہیں نیک آپ کو سمجھتے مجھے بیسوا پکارتے ہیں
وہ مگر ہیں اصلیت سے کورے نری باتیں ہی بگھارتے ہیں
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہو وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہو
ہو نکاح یا کہ آشنائی کسی رنگ سے ہو پیٹ بھرنا
کہیں عیش اور عشق بازی کہیں ایک ہی خصم کا بھرنا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہو وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہو
مجھے ایک تیتری سمجھیے مرا کام پھول پھول اُڑنا
کہیں رس کے واسطے ٹھٹکنا کہیں پنکھڑی پہ جھول اڑنا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہو وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہو
مری زندگی بڑا سبق ہو کہ یہاں کی خوب سیر کی ہو
ہو مزے کی چیز یہ دُنیا نہ تو شر کی ہو نہ خیر کی ہو
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہو وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہو

برکھا رُت کا پہلا مینہ

آئے بادل کالے کالے جھومتے ہاتھی متوالے — اُمڈے پھیلے تُلتے جھکتے
ایک اندھیری دے کر چھائے ڈیرے چار طرف ڈالے — پون کے گھوڑے سہمے ٹھٹکے

بجلی چمکی انگارا سی آگ کی ناگن لہرائی — لہریا کاڑھا بیل بنائی
بھاپ کے دریا میں قدرت نے نور کی مچھلی تیرائی — اِدھر اُدھر تڑپی تڑپائی

بادل گرجے وہ گڑگڑاہٹ آئی لڑھکتی لڑھکاتی   کڑوڑ ہا گھوڑے دوڑاتی
باڑھوں پہ باڑھیں داغتی آئی اور کڑکتی کڑکاتی   پہاڑ لڑھکاتی ٹکراتی

بجلی چمکی بادل گرجے مینہ اور پون دھنواں دھار   زور کا پانی وہ دھائیں دھائیں
بجلی ناچے تھاپ گرج کی مینہ نے چھیڑ دیا ستار   پون کا گانا وہ سائیں سائیں

بادل بکھرے نیلا امبر ڈوبتے سورج نے جھانکا   کرنیں سنہری ترچھی ترچھی
بکھریں ہوا میں کھیلتی کھیلتی میگھ کو سارا رنگ دیا   آکاش پہ اک آگ لگائی

عزیز لکھنوی

جلوہ دکھلائے جو وہ اپنی خود آرائی کا — نور جل جائے ابھی چشمِ تماشائی کا
رنگ ہر پھول میں ہے حسنِ خود آرائی کا — چمنِ دہر ہے محضر تری یکتائی کا
اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا
اُف ترے حسنِ جہاں سوز کی پرزور کشش — نور سب کھینچ لیا چشمِ تماشائی کا
دیکھ کر نظمِ دو عالم ہمیں کہنا ہی پڑا — سلسلہ ہے یہ کسی انجمن آرائی کا

گل جو گلزار میں ہیں گوش برآواز عزیز
مجھ سے بلبل نے لیا طرز یہ شیوائی کا

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا — وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا
واہمہ مجھ کو دکھاتا ہے جنوں کے ساماں — نظر آتا ہے مجھے گھر کا بیاباں ہونا
حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گزرے ہیں — میرا مرنا تری زلفوں کا پریشاں ہونا
جوش میں لے کے اک انگڑائی کسی کا کہنا — تم کو آتا ہی نہیں چاکِ گریباں ہونا
سُرخ ڈورے تری آنکھوں کے الٰہی توبہ — چاہیے تھا انھیں پیوستِ رگِ جاں ہونا
ہو چلیں آپ کے بیمار کی آنکھیں بے نور — قہر تھا صبح کے تارے کا نمایاں ہونا

ان سے کرتا ہے دمِ نزع وصیت یہ عزیز
خلق روئے گی مگر تم نہ پریشاں ہونا

وہ نگاہیں کیا کہوں کیوں کر رگِ جاں ہو گئیں
دل میں نشتر بن کے ڈوبیں اور پنہاں ہو گئیں

تھیں جو کل تک جلوہ افروزی سے شمعِ انجمن
آج وہ شکلیں چراغِ زیرِ داماں ہو گئیں

اک نظر گھبرا کے کی اپنی طرف اس شوخ نے
ہستیاں جب مٹ کے اجزائے پریشاں ہو گئیں

اڑ کے دل کی خاک کے ذرّے گئے جس جس طرف
رفتہ رفتہ وہ زمینیں سب بیاباں ہو گئیں

اِس کی شامِ غم پہ صدقے ہو مری صبحِ حیات
جس کے ماتم میں تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

یہ مشورہ بہم اُٹھے ہیں چارہ جو کرتے ۔۔۔ کہ اب مریض کو اچھا تھا قبلہ رُو کرتے
زبان رُک گئی آخر سحر کے ہوتے ہی ۔۔۔ تمام رات کٹی دل سے گفتگو کرتے
سوادِ شہرِ خموشاں کا دیکھیے منظر ۔۔۔ سنا نہ ہو جو خموشی کو گفتگو کرتے
یقین تھا کہ ملنا ہیں زمیں کی کچھ جا تیں ۔۔۔ بحدِّ سعی اگر اس کی جستجو کرتے
تمام رونے کی لذت اسی پہ تھی موقوف ۔۔۔ کہ زندگی میں کبھی تم سے گفتگو کرتے
جواب حضرت ناصح کو ہم بھی کچھ دیتے ۔۔۔ جو گفتگو کے طریقے سے گفتگو کرتے

پہنچ کے حشر کے میداں میں بھول کیوں ہم ترنگ
ابھی تو پہلی ہی منزل ہے جستجو کرتے

متفرق اشعار

شمع بجھ کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا — یادگارِ حسن و عشق اک داغ دل پر رہ گیا

آگ تو دل کی بجھا لینے دو پھر کچھ پوچھنا
ہوش کس کو جو بتائے کیا رہا کیا جل گیا

ہے ان کی بزم میں ہر شخص اپنے عالم میں
کسی کا راز کسی پر عیاں نہیں ہوتا

تا چند ضبطِ آہ کہ مرنے لگا ہوں جی — یا آج آسمان نہیں یا ہمیں نہیں

بزمِ مطرب میں کبھی سوز نہ ہو ساز نہ ہو — پردۂ ساز میں گر آپ کی آواز نہ ہو
آج صیاد نے فرمانِ رہائی تو دیا — مگر ان کو کہ جنھیں طاقتِ پرواز نہ ہو

چند کشتوں کے تڑپنے کا سماں دیکھا ہے
مرنے والوں کو ابھی تم نے کہاں دیکھا ہے

اک تغیر حسن کی فطرت میں برپا ہو گیا
جب مرے شکوے انھیں کچھ کچھ مزا دینے لگے

کب اکیلے اس جہاں سے ہم گئے — لے کے اپنے ساتھ اک عالم گئے

دل نے دُنیا نئی بنا ڈالی — اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی
ہجر کی رات کاٹنے والے — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

دل تابعِ کشش تھا کشش تابعِ جمال — ہاں ہاں محبت آپ سے کی اور ضرور کی

دُنیا کہاں رہے گی بتا اے نگاہِ مست — ایسے ہی چند دور جو ساغر کے ہو گئے

تھی صبح اور ستارے کچھ جھلملا رہے تھے — بیمارِ شامِ فرقت دُنیا سے جا رہے تھے

عبدالرحمٰن بجنوری

معلّم الملکوت

تھا عدم میں نقشِ ہستی جب کہ بے نام و نمود
قدرتِ خالق نے پائی تھی نہ خلقت میں نمود

سب سے پہلے لفظِ کُن بن کر قضا ظاہر ہوا
حلقۂ پرکاری کو جس کے وقت رہ پیما ہوا

وسعتِ عالم نے پائی وسعتِ بحرِ اثیر
قدرت اور طاقت تھیں یکجا جس کی موجوں میں اسیر

کشمکش نے دونوں کی آمادہ اک طوفاں کیا
الفت اور نفرت نے برپا سخت اک ہیجاں کیا

ارتعاشِ عشق نے پیدا کیا وہ سوزِ دل
ہو گیا جس کے اثر سے آبِ دریا مشتعل

سینۂ دریا سے باہر نکلا اک روشن سحاب
در فشارِ خود گرفتہ گرمیٔ صد آفتاب

قرنہا تک جب یہ آتش خانہ یوں جلتا رہا
جوں سمندر اس کے انگاروں سے میں پیدا ہوا

میں سراپا شعلہ تھا اور وہ سراپا نور تھا
میں کہاں اور وہ کہاں لیکن نہ اس سے دور تھا

حسن جب اظہار جو جلوہ کناں کوئی نہ تھا
بہرِ روئے یار اس دم میں ہی تو... آئینہ تھا

سب سے پہلے معرفت سے میں نے ہی جانا اسے
سب سے پہلے میں نے عالم ہی میں پہچانا اسے

عمرہا یوں شعلہ افشاں رہ کے یہ نارِ عظیم
بجھ گئی پس ماندہ باقی رہ گئی خاکِ لئیم

وائے قسمت تھا نہ میں واقف یہ ہے خاکِ رقیب
کاش اسی دم مجھ کو ہوتا علم اے میرے نصیب

عرش کا پایہ پکڑ کر روتا کہتا اے خدا
خالقِ کون و مکاں! فریاد ہے عالم پناہ

کر نہ پیدا اس کو روئے ارض پر یہ بدنہاد
ڈالے گا عصیاں سے اپنے کل خدائی میں فساد

تھا یونہیں امرِ قضا ہونا جو تھا وہ ہی ہوا
امرِ حق صادر ہوا [illegible]

کل فرشتوں نے گِلِ مردود کی تخمیر کی
اور آب و گِل سے اس کی صورت اک تعمیر کی

قلب ماہیت سے عاری کالبد عریاں سفید — بے پر و شہپال چشم و سر سیہ دنداں سفید
وارثِ تختِ خلافت رونقِ باغِ جناں — ہے یہ آدم سب کرو سجدہ اسے خورد و کلاں
حکم باری پر ملائک نے اسے سجدہ کیا — سب خمیدہ ہو گئے اک میں ہی باقی رہ گیا
اس کو سجدہ کرنے میں کیا کچھ تجھے انکار ہے — "ہاں مجھے انکار ہے انکار ہے بس عار ہے"
"عار ہے" کہتا ہے کیا ڈر تجھ پہ ہے قہرِ خدا — عار ہے تجھ کو ملائک تک نے جب سجدہ کیا
ان کی حالت اور ہے اور میری حالت اور ہے — رسمِ طاعت اور ہے رسمِ محبت اور ہے

حکم ربّی ہے کہ میں سجدہ کروں لیکن نہیں
غیر کو سجدہ کروں مجھ سے تو یہ ممکن نہیں

نٹ راجا

لغزش میں نشے کے بُتِ طنّاز شرابی
سیماب مقابل
گرداب مماثل
تصویر برہنگی میں ہے رقصاں تنِ شیوجی

یک دست میں گردش میں رواں شیشۂ عرفاں
زہر آب بہ نوشیں
پیکر کا لۂ نوریں
یک دست میں انوار فشاں شعلۂ یزداں

دارائے جہاں بت شکنِ مادہ باطل
منصورِ حقیقی
مغلوبِ مجازی
دُنیائے دنی طفلکِ افتادۂ غافل

ہیں انگلیاں بے تاب کہ جنبش ہیں خدائی
سرشوخیٔ مدہوش
موسیقیٔ خاموش
اعجاز ہی ہر ضربۂ انگشت الہٰی

آغوش میں فوّارۂ یخ بستہ کی برقاب
تحریکِ خموشاں
خاموشیٔ جنباں
کب قید ہو تصویر میں رقصاں شوخیٔ بےتاب

عزیز احمد عزیز

سنورینا

(سان ریمو۔ اطالوی ریویرا۔ گرمیوں کے موسم میں سرِ شام سمندر کے کنارے)

سنورینا نے کہا "سچ کہنا
اور کس کس سے یہی تم نے کہا"
"رک گیا میں تو کہا" پھر خاموش؟
ایک دو جام میں اتنے مدہوش"
ان کی آنکھوں کو جو دیکھا تو شرارت کی جھلک
اور ہونٹوں پہ وہی برقِ تبسم کی چمک
جسم میں تازگی و عطر و نفاست کی مہک
ہاتھ کو چوم کے میں نے یہ کہا
"ہے یہ الزام ذرا بے جا سا
سئے گلفام کو کیوں کرتی ہیں ناحق بدنام
ہیں خطاکار تو ہیں آپ کی آنکھوں کے جام
آپ کے حسن سے سرشار ہوں میں
لیجے انصاف خطاوار ہوں میں؟"
سنورینا نے کہا" سچ کہنا
اور کس کس سے یہی تم نے کہا؟

ایسے جملوں کی تو شاید تمھیں عادت سی ہو
ہاں تمھیں ہر کس و ناکس سے محبّت سی ہو
ہو سبھی مردوں کی عادت جو یہی
کاش اک تھوڑی سی جدّت ہوتی"
پھیلتی جاتی تھی تاریکیٔ شام
دستِ نازک کو لیا مَیں نے تھام
مڑ کے دیکھا تو کوئی اور نہ تھا
اس کے رخساروں کو جھک کر چوما
پھر کہا "مجھ کو ترے حسنِ فروزاں کی قسم
تیری آنکھوں کی ترے کاکلِ پیچاں کی قسم
اس خموشی میں سمندر کے ترنم کی قسم
تیرے ہونٹوں پہ ملامت کے تبسم کی قسم . . . ."
مَیں ابھی اور بھی قسمیں کھاتا
اس تبسم نے مگر روک لیا
سنوریتا نے کہا "سچ کہنا
اور کس کس سے یہی تم نے کہا"

خلیفہ عبدالحکیم

دل یہ کبھی تو کعبہ ہے اور کبھی سومنات ہے

اشک بہاکے کیوں کہوں جو ہے سو بے ثبات ہے
ذوقِ تغیرات ہیں
تازگیٔ حیات ہے

جامۂ زندگی کا رنگ تازہ بہ تازہ نو بہ نو
حسنِ رخِ حیات ہے
عظمتِ کائنات ہے

نقطۂ تیز سیر سے بن گئے دائرے یہاں
لاکھ طرح ہوئی بیاں
اصل میں ایک بات ہے

ہوگئیں کیا نظر فروز کثرتِ غم کی ظلمتیں
اتنی ہے تابشِ نجوم
جتنی اندھیری رات ہے

شغل مرا صنم گری اور کبھی حرم گری
دل یہ کبھی تو کعبہ ہے
اور کبھی سومنات ہے

فنِ لطیف

پیغام برِ عشق کبھی شعر کبھی چنگ
اور حسن کا حامل ہے کبھی رنگ کبھی سنگ
دنیائے لطافت میں ہے پیکارِ ہم آہنگ
اظہارِ حقیقت پہ ہے لفظوں کی قبا تنگ

فطرت نے تھا ادراک سے جو راز چھپایا
وہ تو نے بتایا

تجھ سے ہی لبِ دردِ نہاں پر ہے تبسم
آسودہ کنارے کی طرح شورِ تلاطم
ہنگامۂ ہستی کو بناتا ہے ترنم
کثرت کی کشاکش خُمِ وحدت میں ہوئی گم

جس ذات کی خلوت میں نہ زماں ہے نہ مکاں ہے
وہ تجھ پہ عیاں ہے

ہے ساز میں اعراض کے یہ ذات کی آواز
یا نفیِ حقیقت میں ہے اثبات کی آواز
ہے فطرتِ ساکت کی مناجات کی آواز
جو بات ہے بے صوت ہے اُس بات کی آواز

یہ دل کی شریعت ہے، یہ دل کی ہے طریقت
افشائے حقیقت

ہر راگ ہے آئینۂ زیر و بمِ ہستی

آئینے میں لیکن نہ بلندی ہے نہ پستی
بے ہوشی میں بھی محرمِ اسرار ہے مستی
روحوں کو غذا دیتی ہے یہ مادّہ پرستی

جو ذوقِ کشاکش ہے ہر اک ذرّے میں بے تاب
ہے تجھ میں سکوں یاب

تیرے حرمِ ناز میں ہے پردہ رُخِ بود
جو دہر میں مفقود ہے وہ تجھ میں ہے موجود
ہے تیری کرامت جو زیاں کو بھی کرے سود
تو باغِ براہیم، جہاں آتشِ نمرود

افسوں سے ترے قطرۂ خونِ سرِ مژگاں
ہے نکہتِ جاں

سمجھے گا یہاں کون، ہے کیا نیک ہے بد کیا
اس گتھی کے سلجھانے میں حیراں ہے خرد کیا
اس زندگی و مرگ میں کیا جزر ہے مد کیا
ہستی ہے ابد کوش، ہے اس کی کوئی حد کیا

کچھ حسن ہے کچھ عشق ہے اس راز سے آگاہ
ہے راست یہی راہ

فانیؔ بدایونی

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانیؔ زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا

بھر لے نگہ آخر بے رنگ میں ہر رنگ دُنیا کو بھی لیتا ہوا دُنیا سے گزر جا

فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا
منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

یوں نہ کسی طرح کٹی جب مری زندگی کی رات
چھیڑ کے داستانِ غم دل نے مجھے سلا دیا

موت ہستی پہ وہ تہمت تھی کہ آساں نہ اٹھی زندگی مجھ پہ وہ الزام کہ مشکل سے اٹھا

بھڑک کے شعلۂ گل تو ہی اب لگا دے آگ کہ بجلیوں کو اب مرا آشیاں نہیں ملتا
وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا

شعبدے ایسے آنکھوں کے کتنے ہم نے دیکھے ہیں
آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا

اپنے کمالِ شوق پر حشر کا دن ہی منحصر
وعدۂ دید چاہیے زحمتِ انتظار کیا

خطاب روزِ حشر کی صدائے بازگشت ہوں
جوابِ بے سوال ہوں سوالِ بے جواب ہوں

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

ہم کو مرنا بھی میسر نہیں جینے کے بغیر
موت نے عمرِ دو روزہ کا بہانا چاہا

تری جفا کے سوا بھی ہزار تھے انداز
کوئی تو اہلِ وفا کا مزاج داں ہوتا

پاتا ہوں آج بھی خلشِ نوکِ خار میں
بھولا نہیں ہوں لطفِ تبسم بہار کا
تنکوں سے کھیلتے ہی رہے آشیاں میں ہم
آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانیؔ
کیا کرو گے وہ اگر یاد آیا

عشق ہے پرتوِ حسنِ محبوب
آپ اپنی ہی تمنا کیا خوب

طلب محض ہو سارا عالم   کوئی طالب ہو نہ کوئی مطلوب

نہ آ قریب کہ پروردۂ فنا ہوں میں   بنا ہو برق کے تنکوں سے آشیاں میرا

نامراد اپنے تک نامراد جیتے ہیں   سانس بن گیا اک اک نالہ نارسا ہوکر
اور بندے ہیں جن کو دعویٰ خدائی ہو   تھی ہماری قسمت میں بندگی خدا ہوکر
بڑھتا ہو نہ گھٹتا ہو مرتے ہیں نہ جیتے ہیں   درد پر خدا کی مار دل میں رہ گیا ہوکر

روح ارباب محبت کی لرز جاتی ہو   تو پشیمان نہ ہو اپنی جفا یاد نہ کر

جی ڈھونڈتا ہو گھر کوئی دونوں جہاں سے دور
اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور
شاید میں درخورِ نگہِ گرم بھی نہیں
بجلی تڑپ رہی ہو مرے آشیاں سے دور
ہو منع راہِ عشق میں دیر و حرم کا ہوش
یعنی کہاں سے پاس ہو منزل کہاں سے دور
تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور
فانیؔ دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

صوزِ منصور و طورارے توبہ ایک ہی تیری بات کا انداز
آج روزِ وصالِ فانی ہی مدّت سے ہو رہے ہیں نازو نیاز

کچھ نہ وحدت ہی نہ کثرت نہ حقیقت نہ مجاز
یہ ترا عالمِ مستی وہ ترا عالمِ ہوش

موت ہی اک وقفۂ موہوم زندگانی سے زندگانی تک
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا بات پہنچی تری جوانی تک

نہ ابتدا کی خبر ہی نہ انتہا معلوم رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم
یہ زندگی کی ہی رُوداد مختصر فانی وجودِ دردِ مسلّم علاج نامعلوم

جیے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں
کیے جائیں گے دل کے خاتمے پر شکر کے سجدے
وفاؤں نے کیا ہی خونِ حسرت سے وضو برسوں

رُک رُک کے جو سانسیں آئیں گئیں مانا کہ وہ آہیں تھیں لیکن
آپ نے تیور کیوں بدلے آہوں میں کسی کا نام نہیں
دل سے کسی کی آنکھوں تک کچھ راز کی باتیں پہنچی ہیں
آنکھ سے دل تک آیا ہو ایسا تو کوئی پیغام نہیں

بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شام غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں
دو تین ہچکیوں میں دم نزع کہہ گیا
شرح درازیٔ زندگی مختصر کو میں

دل وقفِ تپش ہی ہائے مگر وجہِ تپشِ دل کوئی نہیں
بسمل ہوں مگر کیوں بسمل ہوں فریاد کہ قاتل کوئی نہیں
کس زعم میں ہی اے رہروِ غم دھوکے ہیں نہ آنا منزل کے
یہ راہ بہت کچھ چھانی ہی اس راہ میں منزل کوئی نہیں
بس اُن پہ نہ ان کی یاد پہ ہی تقدیر کے کیا کیا پہلو ہیں
تدبیر سے حاصل کچھ بھی نہیں تدبیر سے غافل کوئی نہیں
خود حسن کمالِ حسن ہی یعنی حسن جہاں ہی کامل ہی
اور عشق مآلِ عشق ہی یعنی عشق میں کامل کوئی نہیں
ہستی ہی نہیں جو باطل ہو پھر فرق مجاز و حقیقت کیا
ہر عرض حقیقت ہی وہ حقیقت ہستی باطل کوئی نہیں
فانیؔ ہی وہ اک دیوانہ تھا جو موت سے پہلے مرجاتا
کیا ہوش کی کافر دنیا میں اس موت کے قابل کوئی نہیں

فانیؔ ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھلے ہوئے تو ہیں

سنتے تھے محبت آساں ہی واللہ بہت آساں ہی مگر
اس سہل میں جو دشواری ہی وہ مشکل سی مشکل میں نہیں
جب ڈوبنے والے ڈوب چکے اور ساحل و دریا ایک ہوئے
پھر لطفِ امید و بیم کہاں دریا میں نہیں ساحل میں نہیں

بہار لائی ہے پیغام انقلابِ بہار سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے کو

غلط انداز نگاہوں کو سنبھال میری گستاخ نگاہی کو نہ پوچھ

کافر صورت دیکھ کے منہ سے آہ نکل ہی جاتی ہے
کہتے کیا ہو اب کوئی اللہ کا یوں بھی نام نہ لے

اس کے سوا نہیں خبرِ آشیاں مجھے میں تھا اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی

مری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہے
ٹھہر جائے تو انگارہ ہے بہہ جائے تو دریا ہے
اسی کو تم مگر ائے اہلِ دنیا جان کہتے ہو
وہ کانٹا جو مری رگ رگ میں رہ رہ کر کھٹکتا ہے

اجل بس ایک ہی کانٹا نکال کر چل دی کھٹک کہ خارِ تمنا ابھی کھٹکتا ہے

نگاہِ ناز و سوزِ عشق دونوں ایک ہیں لیکن
کہیں ہوتی ہے یہ بجلی کہیں معلوم ہوتی ہے
عجب عالم ہے موجِ برق کے پہلو میں یا دل کا
تری الٹی ہوئی سی آستیں معلوم ہوتی ہے

گناہ گار کی حالت ہے رحم کے قابل
غریب کشمکش جبر و اختیار میں ہے

اچّھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ
ایک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قید و حیات
مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

دُنیا مری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دُنیا بستی تھی اب بھی دُنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

فانؔی جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے
میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

دل کھوئے ہوئے برسوں گزرے ہیں مگر اب بھی
آنسو نکل آتے ہیں جب دل نظر آتا ہے
موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانؔی
گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے

پھولوں سے تعلق اب بھی ہے مگر اتنا
جب ذکر بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی

گُل خزاں کے راز کا محرم نظر آیا مجھے — ہر تبسم پردہ دارِ غم نظر آیا مجھے
میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات — جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

دو گھڑی کے لیے میزانِ عدالت ٹھہرے — کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے خدا سے پہلے

موج نے ڈوبنے والوں کو بہت کچھ پلٹا — رُخ مگر جانبِ ساحل نہیں ہونے پاتے
کوئی چٹکی سی کلیجے میں لیے جاتا ہے — ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

جل رہے ہیں آج تک دل کے چراغ — طور پر اک شمع جل کر رہ گئی

فصلِ گُل جو یاد آئی آشیاں بھی یاد آیا — فصلِ گُل میں اُجڑا تھا شاید آشیاں اپنا

مزاجِ دہر میں ان کا اشارہ پائے جا — جو ہو سکے تو بہر حال مسکرائے جا

یاد ہے وہ نومیدی میں ہلکی سی جھلک امیدوں کی
ہائے وہ دل کے ویرانے پر دھوکا سا آبادی کا

یاس و اُمید سے کام نہ نکلا دل کی تمنا دل میں رہی
ترکِ تمنا کر نہ سکے اظہارِ تمنا ہو نہ سکا

جن میں تمہارا نور رہا تھا ان میں اندھیرا رہتا ہے — جب سے گئے ہو آنکھوں میں آنسو تو بہت ہیں نور نہیں

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حشر انھیں معلوم نہیں
کلیوں کا یہ طرزِ تبسّم یہ شادابی کیا کہیے

حرفِ تمنّا بے معنی سا نقشِ وفا سو دھندلا سا
دل کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہو دل کی حقیقت کیا کہیے
حشر بھی گزرا حشر میں بھی یہ سوچ کہ ہم نے کچھ نہ کہا
غم کی حکایت کون سُنے گا غم کی حکایت کیا کہیے

کیا عمر میں اک آہ بھی بخشی نہیں جاتی اک سانس بھی کیا آپ کے ناکام نہ لیتے

اللہ رے سکونِ قلب اس کا دل جس نے لاکھوں توڑ دیے
جس زلف نے دُنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی
دل کی یہ ویرانی بھی عجب ہو وہ بھی آخر کیا کرتے
جب دل میں اُن کے رہتے لیتے یہ ویرانی کم نہ ہوئی
انسان کی ساری ہستی کا مقصود ہو فانی ایک نظر
یعنی وہ نظر جو دل میں اتر کر زخم بنی مرہم نہ ہوئی

فراق گورکھپوری

"آج کی دُنیا"

دُنیا کو انقلاب کی یاد آ رہی ہے آج
تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے آج

وہ سر اُٹھائے موجِ فنا آ رہی ہے آج
موجِ حیات موت سے ٹکرا رہی ہے آج

کانوں میں زلزلوں کی دھمک آ رہی ہے آج
ہر چیز کائنات کی تھرّا رہی ہے آج

جھپکا رہی ہے دیر سے آنکھیں ہیولے دہر
کون و مکاں کو نیند سی کچھ آ رہی ہے آج

ہر لفظ کے معانی و مطلب بدل چکے
ہر بات اور بات ہوئی جا رہی ہے آج

یکسر جہانِ حسن بھی بدلا ہوا سا ہے
دُنیائے عشق اور نظر آ رہی ہے آج

ہر ہر شکستِ ساز میں صد لحنِ سرمدی
یا زندگی کے گیت اجل گا رہی ہے آج

یہ دامنِ اجل ہے کہ تحریکِ غیب ہے
کیا شے ہوائے دہر کو سنکا رہی ہے آج

ابنائے دہر لیتے ہیں یوں سانس گرم و تیز
جینے میں جیسے دیر ہوئی جا رہی ہے آج

افلاک کی جبیں بھی شکن در شکن سی ہے
تیوری زمین کی بھی چڑھی جا رہی ہے آج

پھر چھیڑتی ہے موت حیاتِ فسردہ کو
پھر آتشِ خموش کو اُکسا رہی ہے آج

برہم سا کچھ مزاجِ عناصر ہے ان دنوں
اور کچھ طبیعت اپنی بھی گھبرا رہی ہے آج

اک موجِ دُود سینے میں لرزاں ہے اس طرح
ناگن سی جیسے شیشے میں لہرا رہی ہے آج

بیتے جُگوں کی چھانو ہے امروز پر فراق
ہر چیز اک فسانہ ہوئی جا رہی ہے آج

دل میں اٹھا کے رکھ لے گلستاں   کر لے علاجِ تنگیٔ داماں
شبنم و شعلہ حسنِ گلستاں   پرنم پرنم سوزاں سوزاں
آئے گنہگارانِ محبت....   نادم نادم نازاں نازاں
یہ بھی فسانہ وہ بھی کہانی   کیا شبِ وصل اور کیا شبِ ہجراں
آنچ قفس والوں تک آئی   اب کے بہت ہے شورِ بہاراں
کس کے پاؤں کی چاپ ہے دنیا   کون ہے صبحِ ازل سے خراماں
کس نے موت کی نیند اڑا دی   جاگ اٹھی ہے خاکِ شہیداں

یوں ہی فراقؔ نے عمر بسر کی
کچھ غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں

حیات بھی نہ ہو معراجِ آسمان و زمیں   مرا وجود بھی میرا وجود ہے کہ نہیں
جو بھولتی بھی نہیں یاد بھی نہیں آتیں   تری نگاہ نے کہیں وہ کہانیاں نہ کہیں
لبِ نگار ہیں یا نغمۂ بہار کی لَو....   سکوتِ ناز ہے یا کوئی مطربِ رنگیں
اگر بدل نہ دیا آدمی نے دنیا کو   تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں
شروعِ زندگیٔ عشق کا وہ پہلا خواب   تمھیں بھی بھول چکا ہے ہمیں بھی یاد نہیں
ہر انقلاب کے بعد آدمی سمجھتا ہے   کہ اس کے بعد نہ بدلے گی کروٹیں یہ زمیں
ابھی فضاؤں میں ہیں تو انقلاب پلتا ہے   زمیں بھی بپھری ہوئی سی فلک بھی چیں بہ جبیں
بس اک فسانہ یہ اندازِ عشق و شانِ جمال   بس ایک خوابِ پریشاں یہ شورشِ تمکیں
ہر اک ابد کا مسافر ہر اک خانہ بدوش   بہ ہر دیارِ محبت کوئی مکاں نہ مکیں
نگاہِ ناز تری کافری کو پا نہ سکے   ہزار وہ قبلۂ ایماں ہزار وہ کعبۂ دیں
وہ جس نے اہلِ محبت کے ہوش اڑائے تھے   نگاہِ ہوش ربا تھی نہ گیسوئے مشکیں

ہزار شکر کہ مایوس کر دیا تو نے — یہ اور بات کہ تجھ سے بڑی امیدیں تھیں
جھپک جھپک سی گئی ہے بہارِ لالہ و گل — تری نگاہ سے چنگاریاں سی کچھ جو اڑی ہیں
خدا کے سامنے میرے قصور وار ہیں جو — برابر اُن سے نگاہیں مری نہیں ہوتیں
مزاجِ عشق کو لازم ہے اب بدل جانا — کہ کچھ دنوں سے تو سنتے ہیں حسن بھی ہے حزیں
ہُنر تو خیر ہُنر عیب سے بھی جلتے ہیں
فغاں، کہ اہلِ زمانہ ہیں کس قدر کم بیں

چمک کر حسنِ عالم، عالمِ وحدت نہ ہو جائے — کہیں دُنیا کی ہر صورت تری صورت نہ ہو جائے
تری آنکھیں زمانے کے بدلنے کی کہانی ہیں — محبت بھی انھی آنکھوں کی کیفیت نہ ہو جائے
بجائے خلد وعدہ رکھ بھروسا سچّی دُنیا پر — مراد اس سے جو دُنیا رشکِ صد جنّت نہ ہو جائے
ہزاروں مشعلیں گُل کر چلا ہے وقت کا دامن — ترا یہ نورِ ایماں سر بسر ظلمت نہ ہو جائے
محبت میں بدلتا جا رہا ہوں پھر بھی ڈرتا ہوں
فراقؔ آغاز میں جو تھی وہی حالت نہ ہو جائے

آج بھی کام محبت کے بہت نازک ہیں — دل وہی کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا
ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا — آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں — وہی اندازِ جہاں گزراں ہے کہ جو تھا
دیکھ سکنے کی الگ بات مگر حسن ترا — دولتِ دیدۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا

کر عمرِ گزشتہ کو شریکِ غمِ امروز — خاکسترِ ماضی سے کچھ اٹھتا ہے دھواں بھی

جینے والے جی لیں گے　　اب نہ ملو گے اچھی بات

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

جہاں بھی جستجوئے یار میں ٹھہر جاتے　　یقین جان کہ منزل قریب ہی ہوتی

چپ ہو گئے تیرے رونے والے　　دنیا کا خیال آ گیا ہے

یہ بزمِ عام بھی اے دوست بزمِ عام نہیں　　نگاہیں اٹھتی ہیں لیکن کسی کسی کے لیے

دوزخ میں اور آئی قیامت　　جب یہ کھلا جنت بھی یہی ہے

غمِ حیات وہی دورِ کائنات وہی　　جو زندگی نہ بدل دے وہ زندگی کیا ہے

شبِ وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ ذرا　　ترے جمال کی معصومیاں نکھر آئیں

اک فسوں ساماں نگاہ آشنا کی دیر تھی
اس بھری دُنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے　　بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

شام بھی تھی دھنواں دھنواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
تونے تو خیر بے وفائی کی

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم
جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہونے لگا
خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

خیال کو بے اثر نہ جانو عمل کی چنگاریاں ہیں اس میں
کہ آج ظلمت سرائے دل میں جو نور ہے کل وہ نار ہوگا

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

میں پوچھتا تو ہوں مگر جواب کے لیے نہیں
یہ کیوں تری نظر پھری یہ کیوں بدل گئی ہوا

فسردہ کیوں ہے چار بوند آنسوؤں میں کیا نہیں
حرارتیں نئی نئی طراوتیں نئی نئی

وہ سوز و درد مٹ گئے وہ زندگی بدل گئی
سوالِ عشق ہے ابھی یہ کیا کیا یہ کیا ہوا

بس ایک عشق کے خراب ہونے ہی کی دیر تھی
شباب تھا سنور گیا زمانہ تھا گزر گیا

کسی سے چھوٹ کے شاد اور کسی سے مل کے غمیں
فراقؔ تیری محبت کا کوئی ٹھیک نہیں

جہاں کو دے گی محبت کی تیغ آبِ حیات ۔۔۔ ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا
اس اضطراب میں رازِ فروغ پنہاں ہے ۔۔۔ طلوعِ صبح کی مانند تھرتھرائے جا
نگاہِ یار ترا یوں تو ہے پیام کچھ اور ۔۔۔ مگر کرم بھی کیے جا ستم بھی ڈھائے جا

ہزار بار زمانہ اِدھر سے گزرا ہے ۔۔۔ نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

فیض احمد فیضؔ

تنہائی

پھر کوئی یاد آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہ رَو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سُراغ

گُل کرو شمعیں، بڑھادو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

موضوعِ سخن

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
دھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی

اور ان ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہاتھ
ان کا آنچل ہے کہ رخسار، کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

آج پھر حسن دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اپنے افکار کی اشعار کی دنیا ہے یہی جانِ مضموں ہے یہی شاہدِ معنی ہے یہی

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سایہ کے تلے
آدم و حوّا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی اجداد پہ کیا گزری ہے

ان دہکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے

یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لیے ان میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

یہ ہر اک سمت پُر اسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر ایک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دل آویز خطوط!
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

ہم لوگ

دل کے ایواں میں لیے گل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید کے سہمے ہوئے اُکتائے ہوئے
حسنِ محبوب کے سیّال تصوّر کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے
غایتِ سود و زیاں، صورتِ آغاز و مآل

وہی بے سود بحیثیں، وہی بے کار سوال
مضمحل ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں، دہشتِ فردا سے نڈھال
تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں
اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اک الجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوس، چاکِ گریباں کی تلاش

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

حسنِ فطرت

حسن جلبابِ عدم سے جو درخشاں نکلا — وجد میں کون و مکاں بیخود و رقصاں نکلا
ہی جہاں گیر ضیا پاشیِ حسنِ تکوین — اب تو ارمان ترا عالمِ امکاں نکلا
جو سمجھتا ہی کہ انسان ہی ضعیف البنیاں — ذہن سے اس کے نہ اندیشۂ شیطاں نکلا
حسن فطرت سے ہی انسان کی حسن آرائی — غازہ و عطر کا گل بوٹے سے ساماں نکلا
حسن کا ہی یہ وفور اس کو نہ کہو دل تنگی — رنگ بھی سینے سے غنچے کے پرافشاں نکلا

ہی گلِ حسن سے لبریز یہ دُنیا کیفی
نظرِ قلب کا بھی تنگ ہی داماں نکلا

بسنت

دشت بنے ہیں گلستاں — کھیت ہیں کشتِ زعفراں
اُٹھتی ہی آنکھ جس طرف — خلد نگاہ ہی سماں
آج ہوئی ہی کائنات — فیضِ بہار سے جواں

گُل ہی کھلاتی کیا بسنت
زر ہی لُٹاتی کیا بسنت

باغ نیا ہی بن نیا — گُل کا ہی پیرہن نیا

پتیوں کی پھبن نئی پھول کا بانکپن نیا
ہر کہیں ہے فضا نئی ہے فلک کہن نیا

طرّۂ حور ہے بسنت
رشکِ طور ہے بسنت

لو وہ بسنت آگئی قدرتِ حق دکھا گئی
آنکھوں میں بس گئی بسنت دل کی کلی کھلا گئی
داغ کو باغ - باغ کو رشکِ ارم بنا گئی

حور ہے اور پری بسنت
کیسی ہری بھری بسنت

ایک منظر

از مثنوی "جگ بیتی"

تھا اک مقام، فضا جس کی دل بھاتی تھی
ادا سے جس کی پھبن دل میں بیٹھی جاتی تھی

سہانی لغزشیں مستانہ آبشاروں کی
وہ والہانہ لٹک چال جوئباروں کی

تھیں سبز وادیاں پیڑوں میں سر ہرے اونچے پہاڑ
لدی پھندی ہوئی پھولوں سے جھاڑیاں اور جھاڑ

وہ کہکشاں کی سی پانی کی سبزے میں لہریں
کہ سبز مخمل پہ تھیں سیماب کی چھیٹیں لہریں

زمین لال ہرے کھیت ان میں یوں پانی
کہ سرخ سینے پہ پنے کی آب داری تھی
تھا کوہسار کا دل چسپ یوں نشیب و فراز
کہ جیسے شیر و شکر ہو گئے ہوں ناز و نیاز
وہ راگ چشموں کے اور وہ ترانے نہروں کے
کہ پانی پانی تھے نغمے ہزار لہروں کے
وہ جھٹ پٹا بھی انوکھا تھا کوہساروں کا
وہاں تھا ہونے کو اب رت جگا بہاروں کا
رواں تھی چشمے سے شفاف اک رُپہلی چھال
وہ اس کے پیچ و خم اور اس کی وہ ٹھمک کی چال
تھیں دل فریب نرالی ادائیں پانی کی
اڑائے پھرتی تھی اس کو ہوا جوانی کی
نسیم چلتی تو رُک رُک کے دھیمی دھیمی سی
شمیم دیتی تھی لپٹیں تو بھینی بھینی سی

آنند نراین مُلّا

کام کی باتیں

وقت آیا کام کا کچھ کام کی باتیں کریں
تا بہ کے اپنے دلِ ناکام کی باتیں کریں

پھر افق ہے ایک صبحِ نو سے رشکِ لالہ زار
شمع افسردہ لیے کیا شام کی باتیں کریں

کارواں انساں کا ہے پھر زندگی کے موڑ پر
کب تک آخر سجدۂ ہر گام کی باتیں کریں

ہر نفس ہے تیز سے کچھ تیز تر رفتارِ زیست
اب ہمیں فرصت کہاں آرام کی باتیں کریں

خونِ انساں سے لبالب آج ہے جامِ حیات
کس زباں سے حافظ و خیام کی باتیں کریں

لکھ رہی ہے تیغِ خوں آشام تاریخِ جہاں
کس طرح ہم بزمِ مے آشام کی باتیں کریں

زندگی کی تلخیوں سے پھیر کر کب تک نگاہ
شاہد و شمع و شراب و جام کی باتیں کریں

نغمہائے آشیاں ہونے لگے کانوں پہ بار
اب چمن میں مرغِ زیرِ دام کی باتیں کریں

زندگی نے توڑ ڈالے وہ پرانے بت تمام
طاقِ نو ڈھونڈیں نئے اصنام کی باتیں کریں

پختگیٔ عقل اچھی ہے مگر بہتر ہے یہ
گاہے گاہے آرزوئے خام کی باتیں کریں

رفعتوں سے زیست کی بھی کچھ کلامِ جاں نواز
تا بہ کے سطحِ مذاقِ عام کی باتیں کریں

شیخ جی مُلّا پہ لعنت بھیجیے کافر ہے وہ
آئیے ہم آپ کچھ اسلام کی باتیں کریں

تڑپ شیشے کے ٹکڑے بھی اڑا لیتے ہیں ہیرے کی
محبت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی

کرنِ مہتاب کی پھولوں میں جب تھی جانِ تسکیں تھی
یہی ذرّوں میں کیا آئی کہ موجِ اضطراب آئی

جفا صیّاد کی اہلِ وفا نے رائگاں کر دی قفس کی زندگی وقفِ خیالِ آشیاں کر دی
بھرم حسنِ حقیقت کا کوئی کھلنے نہیں دیتا نظر جب سامنے آئی تجلّی درمیاں کر دی

اب کوئی صدا میری صدا پر نہیں دیتا آوازِ رباب اور تھی آوازِ فغاں اور

آنکھوں میں کچھ نمی سی ہو ماضی کی یادگار گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی

زیست کی راحتوں میں بھی غم نہ ترا بھلا سکے لب سے ہنسے ہزار بار دل سے نہ مسکرا سکے

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

سختیِ زیست عشق سے دور نہ ہو سکی مگر پھول تو کچھ کھلا دیے دامنِ کوہسار میں

بآلِ زیست سے گھبرا کے کر نہ خونِ شباب خزاں کے خوف سے رسوائی بہار نہ کر

مجازؔ

رات اور ریل

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نصف شب کی خامشی میں زیر لب گاتی ہوئی

ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی

جیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کا گیت
ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی

نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی

ٹھوکریں کھا کر مچلتی، گنگناتی، جھومتی
سرخوشی میں رقص کے انداز دکھلاتی ہوئی

ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی

رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی، کانپتی
پٹریوں پر دور تک سیماب چھلکاتی ہوئی

جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات
شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی

منتشر کرکے فضا میں جا بجا چنگاریاں
دامنِ موجِ ہوا میں پھول برساتی ہوئی

تیز تر ہوتی ہوئی منزل بہ منزل دم بدم
رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی

سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار
ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی

ایک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو چرخ سے
رفعتِ کہسار سے میدان میں آتی ہوئی

اک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں
جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی

رعشہ برا اندام کرتی انجمِ شب تاب کو
آشیاں میں طائرِ وحشی کو چونکاتی ہوئی

یاد آجائے پرانے دیوتاؤں کا جلال
ان قیامت خیزیوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی

ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ
خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی

پل پہ دریا کے دمادم کو ندتی للکارتی
اپنی اس طوفان انگیزی پہ اتراتی ہوئی

پیش کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں
ساحلوں پر ریت کے ذرّوں کو چمکاتی ہوئی

مرغزاروں میں دکھاتی جوئے شیریں کا خرام
وادیوں میں سیل کے مانند اٹھلاتی ہوئی

اک پہاڑی پر دکھاتی آبشاروں کی جھلک
اک بیاباں میں چراغِ طور دکھلاتی ہوئی

جستجو میں منزلِ مقصود کے دیوانہ وار
اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی

چھیڑ دیتی وجد کے عالم میں سازِ سرمدی
غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی

رینگتی، مڑتی، مچلتی، تلملاتی، ہانپتی
اپنے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی

خود بخود روٹھی ہوئی، بپھری ہوئی بکھری ہوئی
شورِ پیہم سے دلِ گیتی کو دھڑکاتی ہوئی

مارتی جاتی برابر منزلوں پر منزلیں
ایک اک لمحے میں کوسوں کی خبر لاتی ہوئی

آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی

ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی سمٹی ہوئی
ایک مفلس کی طرح سردی میں تھراتی ہوئی

تیزیٔ رفتار کے سکے جماتی جا بجا
دشت و در میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہوئی

ڈال کر گزرے مناظر پر اندھیرے کا نقاب
اک نیا منظر نظر کے سامنے لاتی ہوئی

صفحۂ دل سے مٹاتی عہدِ ماضی کے نقوش
حال و مستقبل کے دل کش خواب دکھلاتی ہوئی

ایک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ دراتی ہوئی

ایک اک حرکت سے انداز بغاوت آشکار
سیے دھڑک آزادیوں کے زمزمے گاتی ہوئی

ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت کی نظر
کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی

دامنِ تاریکیٔ شب کی اڑاتی دھجّیاں
قصرِ ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی

زد میں کوئی چیز آجاتی تو اس کو پیس کر
ارتقاے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی

زعم میں پیشانیٔ صحرا پہ ٹھوکر مارتی
پھر سبک رفتاریوں کے ناز دکھلاتی ہوئی

الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعرِ آتش بیاں کا خون کھولاتی ہوئی

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ رُپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر چلتی ہوئی شمشیر سی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارا پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رُک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہم نوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں

اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا، سارے کے سارے نوچ لوں
ای غمِ دل کیا کروں، ای وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہو جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
ای غمِ دل کیا کروں ای وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا ہو، سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
ای غمِ دل کیا کروں ای وحشتِ دل کیا کروں

سیّد مقبول حسین احمد پوری

چھائی گھٹا گھنگھور

کالے کالے بادل آئے چھائے چاریوں اور
سکھی ری چھائے چاریوں اور
ہوا چلے اور بوندا برسیں، بن میں ناچے مور
سکھی ری بن میں ناچے مور
چھائی گھٹا گھنگھور سکھی ری چھائی گھٹا گھنگھور

اندر لوک میں باجا باجے ہوا مچاوے شور
سکھی ری ہوا مچاوے شور
کالی کالی رات ڈراوے جیا گھبراوے مور
سکھی ری جیا گھبراوے مور
چھائی گھٹا گھنگھور سکھی ری چھائی گھٹا گھنگھور

رات اندھیری پھاڑے کھاوے کیسے ہووے بھور
سکھی ری کیسے ہووے بھور
مور سکھی کوئی گیت سناوے گلا سہانا تور
سکھی ری گلا سہانا تور
چھائی گھٹا گھنگھور سکھی ری چھائی گھٹا گھنگھور

رنگ بسنتی چھائے

کھیتوں کھیتوں پھولی سرسوں رنگ بسنتی چھائے
پھول کسم کے کھیت کنارے کیسر گوٹ لگائے
اسی سمے اک پریمی من کو پریم کی بات سہائے
پھولی سرسوں، آئی ہولی، رنگ بسنتی چھائے

تھال میں پھول اور پات لیے کوئی سونے مندر جائے
چھمک چھمک چل چھب دکھلا دے سپھر کو ترپائے
سکھ آنند سمے سمپورن پھر یہ سمے نہ آئے
پھولی سرسوں، آئی ہولی، رنگ بسنتی چھائے

آسا میری سن لو سوامی، دھن دونی ہو جائے
اور یہ شوبھا مورتی کی آنکھوں میں کھب جائے
اور اک سوامی اب کے آؤں بالک گلے لگائے
پھولی سرسوں، آئی ہولی، رنگ بسنتی چھائے

کوئی کہے اک سوامی مجھ کو گیان کی بات نہ بھائے
برس دنا ہونے کو آئے شیام سے پریت لگائے
کب تک راکھوں من کو اپنے سوامی جی لگائے
پھولی سرسوں، آئی ہولی، رنگ بسنتی چھائے

جو ہر اپنی کتھا سنائے اپنی اپنی گائے
دیکھوں سوامی کیسے سراہیں کوئی کا من للچائے
سوامی جی میری بھی سن لو میں بھی آس لگائے ...

پھولی سرسوں آئی ہولی رنگ بسنتی چھائے

پوت سپوت نہ مانگو سوامی مایا مجھے نہ بھائے
اس جگ کی سب شوبھا جھوٹی اس پر دھیان نہ جائے
اپنا مجھے بنالو سوامی روؤں سیس نوائے

پھولی سرسوں آئی ہولی رنگ بسنتی چھائے

نین کٹاری

سن تو سکھی میں تجھ پر واری　　مجھ کو دیکھ ہنسیں نر ناری
میں تو تن من دھن سب ہاری
ہردے لاگی نین کٹاری

کل اشنان کیا جو میں نے　　کوٹھا چھوڑ چڑھی اٹاری
دیکھی صورت سانولی پیاری
ہردے لاگی نین کٹاری

ہاتھ سے میں نے بال نچوڑے　　کنگھی لے کے مانگ نکاری
پہن رہی تھی صندل ساری
ہردے لاگی نین کٹاری

سکھی بتا کچھ تو جگ کھیلی　　نئی نویلی ہیں دکھیاری
مار گیو موکو گردھاری
ہردے لاگی نین کٹاری

منظور حسین صاحب ماہر القادری

نیند کے مارے اک دوشیزہ آنکھیں......

چاند کی رنگت پھیکی سی ہے رات بھی ڈھلتی جاتی ہے
شمع بھی سوزِ دل کے ہاتھوں رنگ بدلتی جاتی ہے
سانس کی تیزی کیا کہیے تلوار سی چلتی جاتی ہے
بادِ صبا ٹھوکر کھاکر ہر بار سنبھلتی جاتی ہے
نیند کے مارے اک دوشیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے

نظم بھی ہے غزلیں بھی ہیں اور گیت بھی ہے تقریر بھی ہے
پھول بھی ہے انگارے بھی ہیں پارا ہے اکسیر بھی ہے
موسیقی کے زیر و بم ہیں اور ان میں تاثیر بھی ہے
نغمے کے طوفانوں میں ہر سانس جھکولے کھاتی ہے
نیند کے مارے اک دوشیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے

ماتھے کی نمناک لکیریں نور کا مینہ برساتی ہیں
ہونٹ ہیں گویا کچی کلیاں آنکھیں کچھ کچھ گاتی ہیں
خود ہی خود غزلوں پر غزلیں موزوں ہوتی جاتی ہیں
زلف کی بے ترتیبی رُخ پر اور قیامت ڈھاتی ہے
نیند کے مارے اک دوشیزہ آنکھیں ملتی جاتی ہے

صبحِ بہاراں

کانٹوں کی نوکیں رشکِ گُلِ تر
پھولوں کا جوبن اللہ اکبر
ہر برگ رنگیں ہر گُل معطّر
دل کش تماشا دل چسپ منظر
صبحِ بہاراں

کلیوں کی چاندی شبنم کے گوہر
کرنوں کا سونا پھولوں کے زیور
کونپل کے جگنو پتّوں کے جھومر
ہر چیز روشن ہر شئی منور
صبحِ بہاراں

غنچوں کے تکیے سبزے کی مخمل
پھولوں کی جھالر شاخوں کا آنچل
آبِ رواں کی باریک ململ
چمپا کا لچکا بیلے کی جدول
صبحِ بہاراں

جنگل کی نزہت خاشاک خس ہیں
کوثر کی موجیں پھولوں کے رس ہیں
کلیوں کی سیجیں کنجِ قفس میں
سارا زمانا مستی کے بس میں

صبحِ بہاراں
بادِ سحر کیا اٹھلا رہی ہے
پھولوں کے تلوے سہلا رہی ہے
خنکی دلوں کو گرما رہی ہے
ایسے میں اُن کی یاد آ رہی ہے
صبحِ بہاراں

چودھری خوشی محمد خاں ناظر

"جوگی اور ناظر"

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیٔ ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوۂ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی ہر شاخ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے ہر سرو و چمن طنبور ہوا
سب طائر مل کر گانے لگے عرفان کی تانیں اڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے دل کش وہ سماع طیور ہوا
سبزے نے بساط بچھائی تھی اور بزم سرور سجائی تھی
بن میں گلشن آنگن میں فرشِ سنجاب و سمور ہوا
تھا دل کش منظر دشت و جبل اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظر دیوانہ
چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے پربت پر چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے کہرے نے قنات لگائی تھی
یاں برف کے تودے گلتے تھے چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی

یاں قلۂ کوہ پہ رہتا تھا اک مست قلندر بیراگی
تھی راکھ جٹوں میں جوگی کی اور انگ بھبوت رمائی تھی

تھا راکھ کا جوگی کا بستر اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیب کمر جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی

سب خلق خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی متانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی

جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں اور جھک کر ہیں نے سلام کیا
تب آنکھ اٹھا کر ناظر سے یوں بن باسی نے کلام کیا

کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لیے آکے ستاتے ہو
میں پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں آن پھنساتے ہو

کوئی جھگڑا دال چپاتی کا کوئی دعویٰ گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا تم ہم کو سنانے آتے ہو

ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے اس نگری سے منہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لا کے وہی پہناتے ہو

تم پوجا کرتے ہو دھن کی ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
ہم جوت جگاتے ہیں من کی تم اس کو آکے بجھاتے ہو

سنسار سے یاں مکھ پھیرا ہے من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یاں آنکھ لڑی ہے پیتم سے تم کس سے آنکھ ملاتے ہو

اس مست قلندر جوگی نے جب ناظر پر یہ عتاب کیا
کچھ دیر تو ہم خاموش رہے پھر جوگی سے یہ خطاب کیا

ہیں ہم پردیسی سیلانی مت ناحق طیش میں آ جوگی
ہم آئے تھے تیرے درشن کو چتون پر میل نہ لا جوگی
آبادی سے منہ پھیرا کیوں پربت میں کیا ہے ڈیرا کیوں
ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نورِ خدا جوگی
کیا مسجد میں کیا مندر میں سب جلوہ ہے وجہ اللہ کا
پربت میں نگر میں ساگر میں ہر اترا ہے ہر جا جوگی
جی شہر میں خوب بہلتا ہے واں حسن پہ عشق مچلتا ہے
واں پریم کا ساغر چلتا ہے چل دل کی پیاس بجھا جوگی
واں دل کا غنچہ کھلتا ہے ہر رنگ میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی بازار میں دھونی رما جوگی

ان چکنی چپڑی باتوں سے مت جوگی کو پھسلا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے پھر اس پہ نہ تیل گرا بابا
ہاں شہروں میں غل شور بہت اور حرص و ہوا کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت سادھو کی ہے بن میں جا بابا
ہے شہروں میں شورش نفسانی جنگل میں ہے جلوۂ نورانی
ہے نگری ڈگری کثرت کی بن وحدت کا دریا بابا
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجا کے نہ دوارے جاتے ہیں پرجا کی نہیں پروا بابا
سر پر آکاش کا منڈل ہے دھرتی پہ سہانی مخمل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے شب کو تاروں کی سبھا بابا

جب جھوم کے یاں گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں گاتی ہے ملار ہوا بابا

یاں پنچھی مل کر گاتے ہیں پیتم کی سندیس سناتے ہیں
یاں روپ انوپ دکھاتے ہیں پھل پھول اور برگ گیا بابا

ہے پیٹ کا ہر دم دھیان تمھیں اور یاد نہیں بھگوان تمھیں
سِل پتھر اینٹ مکان تمھیں دیتے ہیں سکھی سے چھڑا بابا

تن من کو دھن میں لگاتے ہو پیتم کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لعل گنواتے ہو تم بندۂ حرص و ہوا بابا

دھن دولت آنی جانی ہے یہ دُنیا رام کہانی ہے
یہ عالم عالمِ فانی ہے باقی ہے ذاتِ خدا بابا

علی حیدر نظم طباطبائی

گورِ غریباں

وداعِ روزِ روشن ہے گجر شامِ غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اٹھتا ہے دہقاں کا
یہ ویرانہ ہے میں ہوں اور طائر آشیانوں کے

اندھیرا چھا گیا دُنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے
جدھر دیکھو اٹھا کر آنکھ ادھر اک ہُو کا ہے عالم
مگس لیکن کسی جا بھیرویں بے وقت گاتی ہے
جرس کی دور سے آواز آتی ہے کبھی پیہم

کبھی اک گنبدِ کہنہ پہ بومِ خانماں ویراں
فلک کو دیکھ کر شکووں کا دفتر باز کرتا ہے
کہ دُنیا سے الگ اک گوشۂ عزلت میں ہوں پنہاں
کوئی پھر کیوں قدم اس کنجِ تنہائی میں دھرتا ہے

قطار اک سامنے ہے مولسریوں کے درختوں کی
وہاں قبریں بھی ہیں مٹی کے جیسے ڈھیر ہوتے ہیں

ہر اک نے مر کے بس دو گز کفن گز بھر زمیں پائی
بسانے والے جو اس گانو کے تھے سب وہ سوتے ہیں

نفس بادِ سحر کا نالۂ پُر درد بلبل کا
ہوئے بے کار سب ان کو اٹھا سکتا نہیں کوئی
رہی بے فائدہ مستوں کی ہو حق شورِ قلقل کا
ہیں ایسے نیند کے ماتے جگا سکتا نہیں کوئی

نہ چولھے آگ روشن ہو نہ اب ان کے گھڑے پانی
نہ گھر والوں کو اب کچھ کام ہو فکر شبستاں سے
نہ بی بی کو سرِ شام انتظار اب ہو نہ حیرانی
نہ بچّے دوڑتے ہیں اب کہ لپٹیں آکے داماں سے

وہی ہیں یہ جنھیں وقتِ درد مہلت نہ تھی دم بھر
وہی ہیں ہاتھ چلتے رہتے ہی تھے بلیشتر جن کے
وہی ہیں یہ جنھوں نے ہل چلائے گیت گا گا کر
بڑے سرکش درختوں کو گراتے تھے تبر جن کے

نہ دیکھیں حال ان لوگوں کا ذلّت کی نگاہوں سے
بھرا ہو جن کے سر میں غرّۂ نوابی و خانی
یہ ان کا کاسۂ سر کہہ رہا ہو کج کلاہوں سے
عجب ناداں ہیں وہ جن کو ہو عُجبِ تاجِ سلطانی

نہیں شایانِ فخر و ناز و نوبت اور نقارہ
جو نازاں جاہ و ثروت پر ہیں ان پر موت ہنستی ہے
وہ ساعت آنے والی ہے نہیں جس سے کوئی چارہ
کہ فانی ہے جہاں، ہر اوج کا انجام پستی ہے

نظر آتے نہیں کتنے مزاروں پر تو کیا غم ہے
چراغاں اور صندل اور گل و ریحاں نہ ہو تو کیا
نہیں نمگیرا اور کمخواب کی چادر تو کیا غم ہے
جو خوش آہنگ کوئی قاریِ قرآں نہ ہو تو کیا

بناتے ہو بہو تصویر اگر مدفن پہ رکھنے کو
پلٹ کر اس سے کچھ نکلی ہوئی سانس آ نہیں سکتی
دعا ہو فاتحہ ہو مرثیہ ہو آہ و زاری ہو
کوئی آواز ان کے کان ہی تک جا نہیں سکتی

خدا جانے تھے ان لوگوں میں کیا کیا جوہر قابل
خدا معلوم رکھتے ہوں گے یہ ذہنِ رسا کیسے
خدا ہی کو خبر ہے کیسے کیسے ہوں گے صاحب دل
خدا معلوم ہوں گے بازوے زور آزما کیسے

زمانے نے مگر کوئی ورق ایسا نہیں الٹا
کہ بادِ فکر سے مہلت یہ پاتے سر اٹھانے کی

مصیبت نے طبیعت کی روانی کو کہاں پسپا
کہ بار آنے پائی جوہرِ ذاتی دکھانے کی

بہت سے گوہرِ شہوار باقی رہ گئے ہوں گے
کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہِ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشت و در میں ایسے بھی کھلے ہوں گے
کہ جن کے مسکرانے میں تھی خوش بو مشکِ اذفر کی

یہ صاحب عزم ہیں گو رزم کی نوبت نہیں آئی
حکومت اپنے قریہ میں کی لیکن دوست دشمن پر
وہ فردوسی یہ ہیں جن کی زباں کھلنے نہیں پائی
وہ رستم ہیں نہیں سہراب کا خوں جن کی گردن پر

مقدر نے انھیں مصروف رکھا قلبہ رانی میں
وگرنہ حکم رانی کا بھی جلوہ یہ دکھا دیتے
عجب کیا شہرۂ آفاق ہوتے خوش بیانی میں
اور اپنے کارنامے اہلِ عالم کو سنا دیتے

رہے مصروف نیکی میں بچے ہر اک برائی سے
نہ زورِ مردم آزاری نہ شورِ فتنہ انگیزی
نہ دولت کی طمع میں بے گناہوں کے گلے کاٹے
نہ کی خلقِ خدا کے ساتھ بے رحمی و خوں ریزی

نہ صحبت میں امیروں کی بھی خونِ جگر کھایا
نہ اونٹایا لہو اپنا کبھی جھوٹی خوشامد سے
نہ مَل کر روغنِ قاز آتشِ نخوت کو بھڑکایا
کہ جس سے خود پسندوں کا تبختر بڑھ چلے حد سے

الگ ہر نیک و بد سے دور دُنیا کے مکائد سے
گئے بیگانہ وار اور خلق میں بیگانہ وار آئے
رہے محفوظ ابنائے زمانہ کے مفاسد سے
قدم راہ توکل سے کبھی ڈِگنے نہیں پائے

نہ دیکھ ان استخوانہائے شکستہ کو حقارت سے
یہ ہے گورِ غریباں اک نظر حسرت سے کرتا جا
نکلتا ہے یہ مطلب لوحِ تربت کی عبارت سے
"جو اس رستے گزرتا ہے تو ٹھنڈی، انس بھرتا جا"

لکھے ہیں نام ان قبروں پہ گو کاواک حرفوں میں
مگر بھولے ہووں کو ٹھیک رستہ یہ بتاتے ہیں
افادہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا اگر سوچیں
کہ جو مرنے سے ناواقف ہیں رستا سیکھ جاتے ہیں

جو آیا ہے جہاں میں یاں سے جانا ہے اسے اک دن
یہ ہوتا ہے کوئی چاہے گا دل سے یا نہ چاہے گا

مگر جاتے ہوئے پھر کر نہ دیکھے یہ نہیں ممکن
دلوں سے یا وبھی مٹ جائے یہ حاشا نہ جائے گا

کوئی زانو کسی کا ڈھونڈتا ہے دم نکلنے کو
کہ دیکھے اشک گرتے چاہنے والے کے دامن میں
کسی کو ہے یہ خواہش دوست کاندھا دیں جنازے کو
پھر اس پر فاتحہ کی آرزو ہے کنج مدفن میں

حقیقت غور سے دیکھی جوان سب مرنے والوں کی
تو ایسا ہی نظر آنے لگا انجام کار اپنا
انھی کی طرح جیسے مل گئے ہیں خاک میں ہم بھی
نہیں پرسانِ حال آ نکلا ہے اک دوست دار اپنا

یہ اس سے ایک دہقانِ کہن سال آکے کہتا ہے
کہ ہاں ہاں خوب ہم واقف ہیں دیکھا ہے اسے اکثر
پھر اس کے بعد دل ہی دل میں کچھ غم کھاکے کہتا ہے
کہ اب تک پھرتا ہے آنکھوں میں پھرنا اس کا سبزے پر

وہ اس کا نور کے تڑکے ادھر گلگشت کو آنا
وہ پو پھٹنے سے پہلے آکے پھرنا سبزہ زاروں میں
وہ کچھ کم دن رہے اس کا لبِ جو کی طرف جانا
وہ اس کا مسکرانا دیکھ کر شورِ آبشاروں میں

کبھی ایسی ہنسی لب پر کہ ظاہر جس سے کچھ نفرت
اور اس کے ساتھ ہی کچھ زیرِ لب کہتے ہوئے جانا
کبھی تیوری چڑھائے منہ بنائے رنج کی صورت
کہ جیسے دل پہ صدمہ ہو زباں جس سے ہو بیگانہ

غرض کیا کیا کہوں اک روز کا یہ ذکر ہے صاحب
کہ اس میداں میں پھرتے صبح دم اس کو نہیں دیکھا
ہوا پھر دوسرا دن اور نظر سے وہ رہا غائب
خیاباں میں اسے پایا نہ دریا پر کہیں دیکھا

پر اس کے تیسرے دن دیکھتا کیا ہوں جنازے کو
لیے آتے ہیں سب پڑھتے ہوئے کلمہ شہادت کا
تمھیں پڑھنا تو آتا ہوگا آؤ پاس سے دیکھو
یہ اس کی قبر ہے اور یہ کتابہ سنگِ تربت کا

اب آغوشِ لحد میں سو رہا ہے چین سے کیسا
گیا افسوس لیکن یہ جواں ناکام دُنیا سے
دکھایا جاہ و شہرت نے نہ بھولے سے بھی منہ اپنا
پھر ایسے نامرادوں کا بھلا کیا کام دُنیا سے

ہر اک کے درد و دکھ سے اس کو رہتا تھا سدا مطلب
ہوا ممکن تو یاری کی نہیں تو اشک باری کی

دیا دستِ تہی کے ساتھ طینت میں کرم یا رب
میں تیری شان کے قربان کیا اچھی تلافی کی

خدا بخشے اسے بس دوست کا رہتا تھا وہ جویا
تو نکلا دوست آخر اک خداوند کریم اس کا
اب اس کے نیک و بد کا ذکر کرنا ہی نہیں اچھا
کہ روشن ہی خدا پر عالم امید و بیم اس کا
(انگریز شاعر گرے کی نظم کا آزاد ترجمہ)

انتخاب غزلیات

ہنسی ہنسی میں وہ بات کہہ دی کہ رہ گئے آپ دنگ ہوکر
چھپا ہوا تھا جو راز دل میں کھلا وہ چہرے کا رنگ ہوکر
شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پُر درد ہی فسانہ
یہ رہ گئی بن کے گردِ حسرت وہ اُڑ گیا رُخ سے رنگ ہوکر

کوچہ کوئی نکلے جو رگِ جاں سے قریں اور
اس گنبدِ بے در سے نکل جایئے کہیں اور

مجھے دوڑا رہا ہی شوقِ منزل کا یہ کہہ کہہ کر
کہ گرنا بار بار اچھا ہی اٹھنا دم بدم اچھا

مٹا دی اس نے ہستی آستینوں کو اگر الٹا
عدم کا اٹھ گیا پردہ جو دامن تا کمر الٹا
نہ بھولیں گی کبھی وہ خلوتیں وہ عشق کی راتیں
کہ پردہ شام سے چھوڑا تو ہنگام سحر الٹا

یہ کس دھوکے میں جاں اپنی دیے دیتے ہیں پروانے
انھوں نے شمع کے شعلے کو شاید تاج زر جانا
زراسی آبرو جو قطرۂ شبنم سے بھی کم تھی
سنا جوہر شناسوں سے اسے آب گہر جانا

سارے عالم کو بنایا ہدفِ تیرِ اجل
قادر انداز نے یہ فعل حکیمانہ کیا
آج گردوں میں کیا شہرۂ آفاق جسے
کل اسے محفلِ احباب کا افسانہ کیا
الحذر نظم بہت جھک کے فلک ملتا ہے
خوف کی بات ہے دشمن نے جو یارانہ کیا

ہستی کا شور تو ہے مگر اعتبار کیا
جھوٹی خبر کسی کی اڑائی ہوئی سی ہے
منزل اسے سمجھ کے کمر کھولتے ہیں ہم
بستی جو رہزنوں کی بسائی ہوئی سی ہے

صبح پیری اور غفلت اس قدر چھائی ہوئی
مسکراتی ہے سرِ بالیں اجل آئی ہوئی

خبر ہوئی خود بخود یہ دل کو وہ ہر را را لاماں نہیں ہے
خوشی یہ کہ کر ہوئی روانہ مرا ٹھکانا یہاں نہیں ہے

اُدھر جوانی کی شام آئی اُدھر ہوئی صبحِ عید پیری
یہ کیسی شام و سحر الٰہی کہ جس میں شب درمیاں نہیں ہے

اگرچہ ہے بے ثباتِ عالم ٹھہر کوئی دم تو اور شبنم
تیرا قدم تو سبک ہے ایسا کہ برگِ گل پر گراں نہیں ہے

فضائے دہر میں ہم مثلِ برق آکے چلے — تڑپ کے کاٹ دیا وقت مسکرا کے چلے
نمودِ رعشۂ پیری ہوا اجل آئی — چراغِ صبح تھے گویا کہ جھلملا کے چلے

سیّد ہاشمی فرید آبادی

سراغِ فہم

قدم نہیں قرار میں حیاتِ مستعار کا — کہ ہے اسیر ہر نفس ہوائے رہ گزار کا
مری زباں میں ہم سفر سیاحتیں ہیں منزلیں — مدام گشت و دشت ہے مقام شہسوار کا

نمایشِ جدید ہی ہر ایک پل حیات کی — جو آنکھ ہو تو روک یاں نہ دن کی ہے نہ رات کی
مناظرِ وسیع ہیں عجب نہیں کہ موت بھی — اک اور راہِ سیر ہو نہفتہ کائنات کی

یہ جستجو ہی گمرہی کہ کیوں چلے کدھر چلے — ترا نصیب چرخ ہے پھرائے جا جدھر چلے
وہی نجومِ بادپا بہت پرے نکل گئے — منازل مدار سے جو رہ کے بے خبر چلے

گھٹا جو جھوم کر پھری شرارہ وار ہو گئی — خزاں بڑھے چلی گئی تو نو بہار ہو گئی
رخِ انبساطِ سیل سے کمال نا امید تھی — کھلی غمِ جمود میں کہ جوئبار ہو گئی

نگس کو رنجِ سعی سے کمال انگبیں ملا — جہادِ باغباں کا پھل کشادِ یاسمیں ملا
یہ مشتِ خاکِ دہر سے ہزار ہا برس لڑی — دماغ آدمی کو تب تمدن آفریں ملا

نہ ماحصل کی انتہا نہ محنتیں حدود میں
عمل کے ساتھ آ گئے نئے جہاں وجود میں
ہوس بھی شوقِ جہد کے لباس میں عزیز ہے
شکست خوردہ موج تک سدا رہی صعود میں

کشاکشِ دوام میں فراغتِ دوام ہے
ہنر شرف کرامتیں مشقتوں کا نام ہے
رُکے نہ تیغ جنگ جو سپاہ کوچ میں رہے
یہی صراطِ امن ہے یہی رہِ سلام ہے

سکوں کو عیش مت سمجھ فریب ماندگی ہے یہ
بسانِ صاعقہ تڑپ تڑپ کہ زندگی ہے یہ
جنونِ پختہ کار کو تلاشِ جاوداں نصیب
نظر ورائے دید ہے کمالِ بندگی ہے یہ

کالی ناگن

جو آدھی رات کی رانی ہے اور پر جا جس کی جانی ہے
اک بانکا تاج دیے سر پر وہ کالی ناگن آتی ہے
ہے اس کی ایک ایک حال میں گت ہے اس کی ساری چال نرت
ہر جنبش پر بالی کی کمر بل کھاتی لچکتی جاتی ہے

یا ہے وہ امنگ جوانی کی اور باہیں کھیلی ترتی ہے
یا سورج ہے بہتے پانی کی اور اہلی گہلی پھرتی ہے
کچھ شرم ہے کچھ خود آرائی ہے نشہ مے کی انگڑائی
بن بنا البیلی کھلتی ہے اٹھ اٹھ متوالی گرتی ہے

وہ نین کٹورے زہر بھرے آنکھوں میں ڈستی ہے
جو آیا زد میں پھر نہ ہلا وہ ظالم سحر کی بستی ہے
قاتل تیور، کافر چتون، اک کالی بجلی سارا بدن
یا کرشن کا اودا جوبن یا پاربتی کی مستی ہے

وہ حسن سیہ کی بن کے سناں سینوں کے پار گزرتی ہے
پر آب تہک پر ہے قرباں اور اچھے رنگ پہ مرتی ہے
کف منہ میں ہیں مجنونانہ اور ساری ادائیں جانانہ
بے تاب ہے عشق کی سوزش سے دم دم پھنکارے بھرتی ہے

بجنوری مرحوم کی وفات پر

صبح کی آمد نہ تھی، اے دیدۂ ظلمت نصیب
وہ کسی فوق النظر تارے کی بھولی تھی کرن
اس فضائے پُر کدورت میں نہ تھا اس کا وطن

- - - - - - - - - -

اب کہاں وہ نورِ شیریں ... ہاں مگر اس کی جھلک
ہے اگر باقی تو ہے شبنم کی نازک روشنی
یا سرِ شب کھلنے والی موتیا کی چاندنی

حُسنِ مُشتہر

وہ دن بھی اے گلِ نوخاستہ ہیں یاد تجھے
چمن میں جب کہ ترا کوئی بے قرار نہ تھا
گیاہ و برگ پیالے سے تری مہک کے نہ تھے
طیور کو ترے جلوے سے اضطرار نہ تھا
چھپی ہوئی تھی شگوفے میں رنگ و بو تیری
ترے جمال کا عالم میں اشتہار نہ تھا

کہا یہ پھول نے شرما کے نکتہ چیں خاموش
کہ ہم کو اپنے نہ کھلنے کا اختیار نہ تھا

یاس یگانہ چنگیزی عظیم آبادی

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

پیام زیرِ لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا
خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا

اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور
اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں تھی
مزاج اس دلِ بے اختیار کا نہ ملا

امیدوارِ رہائی قفس بدوش چلے
جہاں اشارۂ توفیق غائبانہ ملا

ہوا سے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

سمجھ میں آگیا جب عذرِ فطرتِ مجبور
گناہ گارِ ازل کو نیا بہانہ ملا

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

مزا گناہ کا جب تھا کہ باوضو کرتے
بتوں کو سجدہ بھی کرتے تو قبلہ رو کرتے

ازل سے جو کششِ مرکزی کے تھے پابند
ہوا کی طرح وہ کیا سیر چار سو کرتے

ازالۂ دل کی نجاست کا اور کیا ہوتا جلا کے خاک نہ کرتے تو کیا لہو کرتے

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا
پیالہ خالی اٹھا کر لگا لیا منہ سے کہ یاسؔ کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

کیا خبر تھی دل سا شاہنشاہ آخر ایک دن عشق کے ہاتھوں گداؤں کا گدا ہو جائے گا
بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دستِ ہوس گھٹتے گھٹتے ایک دن دستِ دعا ہو جائے گا

قفس میں بیٹھے منانا بھی آ ہی دردِ سر ہو کر نویدِ ناگہاں پہنچی ہے مرگِ منتظر ہو کر
کہاں پرنا رسائی کی ہے پروانوں کی قسمت نے پڑے ہیں منزلِ فانوس پر بے بال و پر ہو کر
جواب آیا تو کیا آیا صدائے بازگشت آئی دہن سے آہ نکلی مبتدائے بے خبر ہو کر
فلک کو دیکھتا ہوں اور زمیں کو آزماتا ہوں مسافر در وطن خانہ بدوشِ رہگزر ہو کر
نگاہِ یاسؔ کا عالم جو آگے تھا وہ اب بھی ہے ہزاروں گل کھلے بازیچۂ شام و سحر ہو کر

خاک پتلا ہے رفتارِ نمو سے مجبور ہمہ تن سنگ بنے یا ہمہ تن دل ہو جائے
ناخدا کو نہیں اب تک تہِ دریا کی خبر ڈوب کر دیکھے تو بیگانۂ ساحل ہو جائے

کعبے کی طرف دور سے سجدہ کر لوں یا دہر کا آخری نظارہ کر لوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا اک اور گنہ کر لوں کہ توبہ کر لوں

چارہ نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا
نا چیز میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیاتِ فانی کیا ہے
جھونکا کھانے سنبھلتے رہنے کے سوا

موجوں سے لپٹ کر پار اترنے والے
طوفانِ بلا سے نہیں ڈرنے والے
کچھ بس نہ چلا تو جان پر کھیل گئے
کیا چال چلے ہیں ڈوب مرنے والے

بے درد دعا مانگنے والا تو کون ؟
کیوں میرے سوا مانگنے والا تو کون ؟
ہنستا ہوں خود اپنے حال پر میرے لیے
رو رو کے دعا مانگنے والا تو کون ؟

وہ جوش وہ اضطراب منزل میں کہاں
وہ شوقِ طلب تھکے ہوئے دل میں کہاں
شاعر کی تہ کو فلسفی کیا پہنچے
منجدھار کا زور شورِ ساحل میں کہاں

ہماری زبان

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار
ہر مہینے کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہے
چندہ سالانہ ایک رُپیہ۔ فی پرچہ ایک آنہ

اُردو

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ
جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے

اس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے۔ تنقیدی اور محققانہ مضامین [illegible] امتیاز رکھتے ہیں۔ اُردو میں جو کتابیں شایع ہوتی ہیں ان پر تبصرہ اس رسالے کی [illegible] خصوصیت ہے۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحے یا اس سے زیادہ ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ [illegible] ول ڈاک وغیرہ ملا کر سات رُپے سکۂ انگریزی (آٹھ رُپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت [illegible] رُپیہ بارہ آنے (دو رُپے سکۂ عثمانیہ)

رسالہ سائنس

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ
(ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد سے شایع ہوتا ہے)

اس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول [illegible] جائے۔ دنیا میں سائنس کے متعلق جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں یا بحثیں یا ایجادیں [illegible] ہوتی ہیں ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے اور ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف [illegible] سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس سے اُردو زبان کی ترقی اور [illegible] وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ رسالے میں متعدد [illegible] بھی شایع ہوتے ہیں۔ قیمت سالانہ صرف پانچ رُپے سکۂ انگریزی (چھ رُپے سکۂ عثمانیہ)
خط و کتابت کا پتا: معتمد مجلس ادارت رسالۂ سائنس۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

الف لیلہ و لیلہ

اس مشہورِ عالم عربی افسانے کی مقبولیت نے اس کے ترجمے دنیا کی ہر زبان میں مہیا کر دیے ہیں۔ اردو میں جو ترجمہ تھا وہ ناقص اور اغلاط سے پُر تھا۔ انجمن نے براہِ راست عربی سے ترجمہ کرایا ہے۔ زبان بہت ہی سلیس اور سادہ رکھی گئی ہے۔ تین جلدیں پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں چوتھی جلد شائع کی جائے گی۔ قیمت حصہ اول بلا جلد [illegible] - دوم بلا جلد [illegible]۔ سوم بلا جلد [illegible]

دیوانِ بہرام

زمانۂ حال کے ایک پارسی اہلِ علم دستور بہرام جی جاماسپ جی کے اردو کلام کا مجموعہ ہے۔ بہرام جی موصوف اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ ان کے کلام کے مجموعے کا شائع ہو جانا یقیناً حامیانِ اردو کے لیے باعثِ مسرت ہوگا۔ قیمت مجلد [illegible] بلا جلد [illegible]۔

مکالماتِ افلاطون

اس شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کیا ہے۔ اس کا بلند رتبہ اربابِ علم و بصیرت کے نزدیک مسلّم ہے۔ اس کا ترجمہ اردو ادب میں گراں بہا اضافہ ہے۔ حجم ۴۹۶ صفحات قیمت مجلّد [illegible]۔ بلا جلد [illegible]

منیجر انجمن ترقیٔ اردو (ہند) دریا گنج دہلی

[illegible]
[illegible]